مضامین شرر جلد ہفتم

نظم و ڈراما

شبِ وصل

کسی کا ہائے وہ راتوں کو چھپ کے یوں آنا
چھڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اُٹھائے ہوئے

دردِ جگر کچھ آج تھما ہے　　زخمی دل کو چین پڑا ہے
شوق بیابان بھولا ہوا ہے　　برسوں بعد زمانہ پھرا ہے
خوب ہوا آرام تو پایا
بےچینی سے چین تو آیا
لو شبِ وصل کی شام آپہونچی　　نکلے گی خوب سی حسرت دل کی
غم جاتا ہے عشرت آئی　　چمکا تارہ قسمت جاگی
آج وہ اپنے قابو میں ہوں گے
ہم بھی اُنکے پہلو میں ہوں گے
جس پر قربان وہ رات اب ہے　　جس کے صدقے آج وہ شب ہے
میان میں اُن کی تیغِ غضب ہے　　وصل نصیب اب اپنا لقب ہے

واہ رے وہ اور اُن کی چاہت
واہ رے میں اور میری قسمت

چرخ پہ کچھ کچھ اندھیرا چھایا — کوئی کوئی ستارہ چمکا
چڑیاں ڈھونڈھ رہی ہیں بسیرا — کوّوں نے اک شور مچایا
دیکھتے ہی دو وقتوں کو ملتے
موت کے خواہاں اٹھ اٹھ بیٹھے

شور ہوا ہر سمت اذاں کا — برہمنوں نے سنکھ بجایا
بجنے لگا ہر دیر میں گھنٹا — نیچر شام کا ہر جا چمکا
دوسری جانب دنیا پلٹی
پیر فلک نے کروٹ بدلی

دیکھو باغ پہ کیا جوبن ہے — پھولوں پر بے ساختہ پن ہے
سارا گلشن جیسے دلھن ہے — کس زوروں پہ بہارِ چمن ہے
کیا اٹھلاتی بادِ صبا ہے
جلد کہیں آ جائیں خدا ہے

آئی رات ہوئی اندھیاری — چرخ پہ تاروں نے کی گلکاری
کیسی رات مبارک ساری — اچھی اچھی پیاری پیاری
اب پازیب بڑھاتے ہوں گے
تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے

سامان وصل کا کر لیں آؤ — شیشے مے سے بھر لیں لاؤ
پھر گزک کچھ جلد منگاؤ — اچھی پلنگڑی لا کے بچھاؤ
اٹھو جا کر شمع جلا دو
سارے کمرے میں پھول بچھا دو

جام صراحی مینا کاری — سرخی مے کی سہانی پیاری
عطر آگین ہے بادِ بہاری — ان کے آنے کی ہے تیاری
غم غلط آج ہمارا ہوگا

پہلو میں کوئی پیارا ہوگا

ہوگیا سارا وصل کا ساماں   کمرا ہے اب جیسے گلستاں
آئی مسہری بہرِ جاناں   ہم سے غمگین ہوگئے شاداں
ساری رفع کدورت ہوگی
آج کسی سے صحبت ہوگی

اب تو ہو چکی شمع بھی روشن   آتے ہیں جھونکے ہوا کے سن سن
پڑ گئی ہر دروازے پہ چلمن   ہر شے پہ ہے برستا جوبن
جن پر قرباں اپنا جگر ہے
کب آئیں گے کس کو خبر ہے

ساماں آنے کا کرتے ہونگے   بیٹھے خوب نکھرتے ہونگے
گیسو رخ پہ سنورتے ہونگے   سینے پہ جوبن ابھرتے ہونگے
پیارا پیارا مکھڑا ہوگا
چہرہ چاند کا ٹکڑا ہوگا

کرتے ہوں گے کنگھی چوٹی   نکلی ہوگی مانگ غضب کی
لگتی ہوگی ہاتھوں میں مہندی   ملتے ہوں گے دانتوں میں مسی
کاجل آنکھوں سے ہوگا نمایاں
چنتے ہوں گے ماتھے پہ افشاں

کیونکر دل کی کلفت جائے   دیر ہوئی اب تک نہیں آئے
دل کو کوئی کب تک بہلائے   کوئی صبر کہاں سے لائے
آخر اُن کے آنے کی حد بھی
اپنے رنج اُٹھانے کی حد بھی

کب تک بیٹھیں کب تک روئیں   کب تک منہ اشکوں سے دھوئیں
کب تک اپنے جی کو کھوئیں   کروٹ بدلیں اور نہ سوئیں
دیکھیں کب ہو آنا اُن کا
بھول گئے وہ آنا کیسا!

باتیں روز بنا جاتے تھے | قسمیں روز ہی کھا جاتے تھے
فقروں میں روز لگا جاتے تھے | کس دن وعدے پہ آجاتے تھے

چھوٹ تم نہ کیوں پہچان گئے ہم!
ہائے غضب! کیوں مان گئے ہم!

ٹھہرو! کس کی آہٹ پائی | چپ ہو! چلنے کی چاپ سی پائی
دیکھو! کس نے جھلک دکھلائی | سنبھلو! دور ہوئی تنہائی

اٹھو! دوڑ کے بوسہ لے لو
دوڑو! جان کو صدقے کر دو

آئے اور کس ناز سے آئے | سہمے گھبرائے شرمائے
سینہ ابھارے سر کو جھکائے | نیچی نظر آنچل لٹکائے

کمرے میں ہم کو بیٹھا پا کر
چھپ گئے دروازے پہ آ کر

رک رک کے وہ کسی کا آنا | چپکے چپکے پاؤں اٹھانا
بیٹھتے ہی باتوں کا بنانا | باتوں باتوں میں شرما جانا

ہائے غضب ڈھانا وہ کسی کا
دور سرک جانا وہ کسی کا

مان نہ جانا ان کا ستم ہے | ہم کو وصل میں بھی اک غم ہے
ہر دم میرے سر کی قسم ہے | ضد سے ان کی ناک میں دم ہے

ہائے وہ بھولی بھولی باتیں
ہائے چلے جانے کی گھاتیں

روٹھ گئے لو بیٹھے بیٹھے! | کون خطا تھی جس پر بگڑے
آخر کچھ کہیے تو ہم سے | لیٹ رہے کیوں منہ کو چھپا کے

کہنا وہ ان کا جب کچھ چھیڑو
”نیند ہے آئی ہم سے نہ بولو“

خود ہی دل میں رحم بھی آیا | دھانی دوپٹہ منہ سے ہٹایا

پیارا پیارا ہاتھ اُٹھایا ڈال کے گردن میں فرمایا
کیوں پھر ایسی بات کہو گے؟
وصل کا پھر ارماں کرو گے؟
ناراضی میں کہتے تھے چل ہٹ خود ہی راضی ہو گئے جھٹ پٹ
پھیر کے میری جانب کروٹ کرنے لگے پھر آپ لگاوٹ
آپ ہی روٹھے آپ ہی بولے
کیا سمجھ کے گئے بن کر بھولے
آپس میں پھر وصل کی ٹھانی چادر لیٹ کے سر سے تانی
چل گئی اپنی سحر بیانی دل کی بات اُنھوں نے مانی
بوسے لینے لگے رل مل کے
لیٹے خوب ہی باہم کھل کے
عید کسی عاشق کے گھر ہے اُڑتا ساغر پر ساغر ہے
شرم سے اُنکی نیچی نظر ہے کوئی نہ آجائے یہ ڈر ہے
لطف اُٹھے کیا کیا صحبت کے
لوٹے خوب مزے وصلت کے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے طائر اپنے جھنجھو سے نکلے
مسجد والے وضو کو اُٹھے رونے والوں نے آنسو پونچھے
کوئی سو گیا روتے روتے
چونک پڑے وہ سوتے سوتے
دن سے توپ کی آواز آئی چلنے والوں کی آہٹ پائی
مرغ سحر نے بانگ لگائی تاروں پہ بھی زردی چھائی
صبح ہوئی کروٹ ہی بدلتے
اُٹھ بیٹھے وہ آنکھوں کو ملتے
صبح کو وہ شرمائی صورت پھیکی پھیکی رُخ کی رنگت
پھولوں کی وہ کم کم نکہت بڑھ گئی ہے کچھ اور نزاکت

کرتے ہیں دل ہی دل میں غصا
کچھ کہتے بن نہیں آتا
چرخ پہ تیاروں کی رخصت　　شمع کی ماہوسانہ صورت
ہائے ہماری یاس اور حسرت　　اور کسی کو جانے کی عجلت
ناز سے اُن کا اُٹھکر جانا
پھر آنے کی قسمیں کھانا
چین پڑے گا دل کو کیونکر　　دیکھ رہے ہیں صبح محشر
بیٹھے ہیں حیران۔ مضطر۔ ششدر　　جان آئی ہے اب تو لبوں پر
بیٹھے شرر ہو کیوں پرحسرت
جل بجھی بجھتے شمع کی قلوت

شبِ غم

دردِ دل۔ زخمِ جگر۔ کلفتِ غم۔ داغِ فراق

کون آفت ہے جو اپنی شب ہجران میں نہیں؟

صدمۂ فرقت ہوشربا ہے　　غم کا سماں آنکھوں میں بندھا ہے
رات اندھیری کالی بلا ہے　　ہو کا عالم رنج فزا ہے
درد کے مارے رو رو دینا
آفتِ جاں ہے سانس کا لینا
رہ رہ کر وہ دل کا اُچھلنا　　آپ ہی آپ کلیجے کا ملنا
اشک کے دریا کا وہ اُبلنا　　رخ کی رنگت کا وہ بدلنا
جب نہ کسی کے ہاتھ پہ سر ہو

دل کو دبا کر رات بسر ہو

یا وہ کسی کا وعدہ کرنا — ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنا
بدخوابی سے چونک کے ڈرنا — مرگ کی خواہش اور نہ مرنا

یاس ہمیشہ شکل دکھائے
موت کہاں کی؟ نیند نہ آئے

صبر و تحمل کام نہ آئیں — درد و الم سے دل بہلائیں
بستر غم پر لوٹ لگائیں — خود جاگیں اور سب کو جگائیں

رات کا گھٹنا امر اہم ہو
دیکھے گھٹے تو دونا غم ہو

ہے ہے کس کا ناز اٹھائیں؟ — کس کو قصۂ ہجر سنائیں؟
کس سے اپنا جی بہلائیں؟ — کون خفا ہے؟ کس کو منائیں

صدمے پہ صدمے غم پہ غم ہیں
ہائے شب غم ہے اور ہم ہیں

نیند کسی کو آتی ہے کیونکر؟ — قابو کیونکر پاتے ہیں دل پر؟
رہتے ہیں کیونکر حیران مضطر؟ — جیتے ہیں کیونکر ہجر میں شب بھر؟

تھک گئے کرتے کرتے نالا
ہم کو تو غم نے مار ہی ڈالا

کس دم یہ اندھیاری ہٹے گی؟ — دیکھیے کس وقت چھٹے گی؟
کیونکر الجھن دل کی گھٹے گی؟ — کیونکر ساری رات کٹے گی؟

گذرے گی یوں ہی سر کو دھنتے
تارے گنتے تنکے چنتے

یہ سناٹا اور تنہائی — وحشت اور تاریکی چھائی
کاٹے کھاتی ہے انگنائی — وہ کیوں آئیں؟ قسم ہی کھائی

جان بھی ہے اب دشمن اپنی
لب تک آئی اور نہ نکلی

کون ایسا ہے جو اُن تک جائے؟ — سارا یہاں کا حال سُنائے؟
جائے! پر کیا جا کے بتائے؟ — کوئی دھیان میں بھی تو لائے؟
روؤ۔ پیٹو۔ اُن کی بلا سے
مر بھی جاؤ اُن کی بلا سے
ٹھہرو! کے بجتے ہیں لوگو؟ — شام ابھی ہے گنتے کیا ہو؟
ناحق محبت کرتے ہو تم تو — تم سے مطلب جو کہتے ہیں گن لو
کمبختوں پر آفت آئے
اتنی دیر میں آٹھ بجائے
لیٹے چین نہ بیٹھے راحت — دل میں اُلجھن۔ منہ پر حسرت
وحشت اور تنہائی آفت — بیتابی اور یاس کی حالت
آنکھوں میں آنسو بھر بھر لانا
رہ رہ رونا۔ مر مر جانا
لوگوں نے ہو گی سونے کی ٹھانی — ہو گی سر سے دُولائی تانی
لیٹے سنتے ہوں گے کہانی — ہوتی ہو گی قصہ خوانی
کیا کسی کی جان کا جانا؟
اُن کو اپنے دِل بہلانا
اُنکو دوپٹہ تان کے سونا — دُنیا بھر سے بے غم ہونا
کیسا رونا۔ کیسا دھونا؟ — کیسا ہوتا ہے جان کا کھونا؟
پھولوں کے اوپر لیٹے ہوں گے
میٹھی نیندیں لیتے ہوں گے
ہر اک اپنے یار کو پائے — پیاری باتوں میں دل بہلائے
چین سے اپنے ساتھ سُلائے — دلبر کو سینے سے لگائے
رنگ چھڑائے خوب مستی کا
چوم لے مُنہ ہر بار کسی کا
سب لوگ ارمان دل کے نکالیں — پیارے گلوں میں باہیں ڈالیں

باتوں میں روٹھوں کو منالیں بادہ کشی میں غم کو ٹالیں
ہم یوں کروٹ بدلیں شب بھر
اس پہلو پر اُس پہلو پر

دیکھے کوئی کلکتے کا جلسا شام نمائش گاہ کا جلوا
پتلی کمر اور نمکیں چہرا لمبے بالوں سے جھونکے کھانا
چلنا رُک کر آنکھیں جھکائے
اور وہ سادی وضع بنائے

سبزہ رنگوں کا جھوم کے چلنا ننگے پانوٴں سے دل کا ملنا
تاک میں وہ تاروں کا ہلنا عینک وہ ہر بار سنبھلنا
کہیے کس کس کا قصّا
کیجیے کس کس یار کا شکوا

چرخ پہ بسنے والے تارو! پیارے پیارے چمکنے والو!
آنکھیں پھاڑے دیکھتے کیا ہو دم بھر کو تو سو لینے دو؟
حاصل! ایک جلے کو جلانا
سینے کے اندر آگ لگانا

لذتِ وصل اُٹھانے والو! دل پر قابو پانے والو!
کوئے یار کے جانے والو! گھر میں کسی کو بلانے والو!
دل میں تمھارے اور ٹھنی ہے
کیا جانو جو ہم پہ بنی ہے

شہر خموشاں والو! بولو خواب پریشاں والو! چونکو
گنجِ شہیداں والو! جاگو گورِ غریباں والو! اُٹھو
جب تک ہجر کے صدمے رہیں گے
تم کو بھی آج نہ سونے دیں گے

اُٹھ بیٹھو سب سونے والو! آنکھیں کھولو محلے والو!
او نگھنے والے پہرے والو! اے دیوار کے نیچے والو!

ہم تو غم کے مارے روئیں
آپ مزے سے لیٹ کے سوئیں

صبر کہاں تک بندہ پرور؟ آخر کتنا جبر ہو دل پر؟
نکلا کلیجا آنکھوں سے بہ کر اس جینے سے مرنا بہتر۔
ٹوٹی قبروں میں سونے والو!
اپنا صدقہ ہم کو بلا لو!

آئی کتنی رات خدایا اب تک کچھ نہیں سننے میں آیا؟
کتوں نے شور الگ سے مچایا ہر جانب سناٹا چھایا
چپ ہیں سارے محلے ٹولے
برقنداز بھی آج نہ بولے

کب تک روئیں اور رلائیں مسجد والوں کو آ کے جگائیں
منبر والوں کو چل کے اٹھائیں شیخ کے سر پر شور مچائیں
پڑھ کے تہجد سونے والو!
وقتِ اذاں ہے جلدی اٹھو

میکشو! وقت صبوحی آیا مہ وشو! جاؤ نہانے گنگا
برہمنو! لو دیر کا رستا طائرو! نکلو چھوڑو بسیرا
واعظو! رات فنا ہوتی ہے
دیکھو نماز قضا ہوتی ہے

پچھلی رات کے سونے والو! صبحِ وطن کے کھونے والو!
کلفتِ غم کے دھونے والو! او بیدار نہ ہونے والو!
آنکھیں ملتے اٹھ اٹھ بیٹھو
کھوٹی ہوتی ہے منزل جاگو

آ گئے اپنی جان سے عاری خاک میں مل گئی رحمت ساری
آج کی رات ہے ہم پر بھاری لے لو قسم جو پلک ہو ماری
کیسی محبت؟ کیسا مرنا؟

کیسا وصل کا ارماں کرنا ؟
لاکھ طرح سے دل بہلایا چین کسی عنوان نہ آیا
سب کو اُٹھایا سب کو جگایا کوئی ہمدم ہائے نہ پایا
تھی اک شمع جو حال شرر پر
آٹھ آٹھ آنسو روئی شب بھر

زمانہ اور اسلام

فلک کے حسیں - اور نیچر کے پیارے چراغِ جہاں - اور زہرہ کے تارے
انہیں اُنکے جو ہوئیں آفت کے مارے گلِ فطرت - اور بزمِ انجم کے نالے
نہیں اب کہیں جلوہ گر ہیں یہ ہوا کیا؟
کہاں چھپ رہے یک بیک؟ ہوگیا کیا؟
چمکنے لگی بجلی - بدلی گھر آئی اُٹھی آندھی اور تازہ آفت ہے لائی
قیامت کی ہے تیرگی یاں تو چھائی نہیں ہاتھ کو ہاتھ دیتا دکھائی
ہے اس خوف سے کیسا خاموش جنگل!
کہ دم بھر میں پڑجائے گی ایک ہلچل
"کوئی کس طرف جائے؟ کیونکر بچائے جاں؟ اکیلا میں! یہ بیکسی! یہ بیاباں
یہ سناٹا! یہ تیرگی! ایسا طوفاں! یہ شورِ وحوش! اور یہ آفت کا ساماں
جدھر دیکھو ہوتی ہے ایک وحشت
کہاں ہائے افسوس لائی ہے قسمت!
اُلجھتا ہے ہر جا یہ کانٹوں میں دامن ہے اُن جھاڑیوں میں درندوں کا مسکن
ادھر دشت میں سخت ہے خوفِ رہزن مگر میں اسی سمت چلتا ہوں قصداً
یہ کہکر مسافر چلا خوف کھاتا
چراغ ایک تھا جس طرف ٹمٹماتا

چلا وہ قدم تھا لگی ایک ٹھوکر گرا زور سے لڑکھڑا کے زمیں پر
گرا اور گرتے ہی سر کو پکڑ کر یہ چلایا۔ "لے وائے میرے مقدر
نہیں مجھ میں طاقت کہ یہ رنج اُٹھاؤں
جو چھٹکارا مشکل ہو تو مر ہی جاؤں

"نہ ہے یاں مددگار کوئی نہ یاور نہ غمخوار کوئی - نہ مونس - نہ رہبر
نظر آتی ہے یاس ہر ہر قدم پر بنایا ہے حسرت نے دلگیر و مضطر
نہیں ہائے! اے موت تجھ کو بھی کچھ دھیاں؟
زمیں تنگ ہے آسماں دُور ہے یاں!

کہاں جاؤں؟" - اتنا ہی تھا کہنے پایا کہ آواز آئی کہیں سے قضارا
"گرا کوئی کیا؟ تھا یہ کیسا دھماکا؟ جو کوئی ہو آواز دے - میں ہوں اس جا
غریبوں کا حسرت زدوں کا ہوں یاور
جو آوارہ ہیں اُنکا ہمدرد و رہبر"

کراہا کیا پہلے تہاں صحرا پھر اک آہ کی - اور رو رو کے بولا
"کسی نے دیا غم میں مجھ کو دلاسا کہ دکھلایا اُمید کا پیارا چہرا؟
پڑا ہوں یہاں اے فرشتے خدا کے
جو طاقت ہو خود لوں قدم تیرے آکے

"نہ یہ پوچھ - میں کون ہوں؟ نام کیا ہے؟ یہ کافی ہے - اک درد کا پُتلا ہے
مصیبت زدہ دشت میں آپھنسا ہے وطن - ہائے معشوق تک سے جدا ہے
خدا جانے کس درد کا یہ بیاں تھا!
کہ غم کا سماں دشت بھر سے عیاں تھا!

وہ آندھی کے آنے کا وقت! اور اندھیرا ہلے اور جُھڑے اُن درختوں کا نقشا
وہ سناٹا! وہ آسماں کا لاکالا! درندوں کا شور اور وہ بادل گرجنا!
رُکی ہر طرف تیرگی سے وہ راہیں!
یہ عالم! اور اُس میں مسافر کی آہیں!

وہ ناطاقتی - ناتوانی سے بے دم! تھکی - اور گری وہ صدا اُسکی پُر غم!

نکلنا وہ آواز کا ضعف سے کم! وہ حسرت کا لہجہ! مصیبت کا عالم!

وہ اُب اُب کے پھولی ہوئی سانس لینا!

وہ رُک رُک کے کچھ دل کو تسکین دینا!

صدا آئی "کس طرح میں تم تک آؤں؟ جہاں تم ہو واں کا نشاں بھی تو پاؤں!

بھی ہو تو کیونکر قدم میں اُٹھاؤں؟" کہا "ہائے! میں کیا کہوں؟ کیا بتاؤں!

نشاں یاں کا خود بھی تو پہچانتا ہوں!

کوئی چیز بھی یاں کی تو جانتا ہوں!

"وہ گم گشتہ رہ ہوں - کہ اپنا پتا بھی نہیں جانتا" آ گئی اس میں آندھی

مسافر نے گو بات پوری کہی تھی مگر اُس کی پُر غم صدا پھر نہ آئی

بلند اب ہوا شور اشجار ایسا

کہ مشکل تھا اپنی بھی آواز سننا

جو یہ حال دیکھا تو وہ مردِ میداں خدا ترس باہمت اور اہلِ ایماں

چلا ہو کے اُس پاشکستہ کا جویاں پھرا دشت میں ہر طرف سخت حیراں

پتا تا کہ اُس غم رسیدہ کا پائے

بنے جس طرح جائے اور ڈھونڈھ لائے

سماں ایک آفت کا اِس دم بندھا ہے جہاں بھر پہ ظلمت کا پردہ پڑا ہے

ہر اک نخل وحشت سے چلا رہا ہے غرض دیکھو جس سمت محشر بپا ہے

برابر گرجتا ہے رہ رہ کے بادل

اور اس شور سے گونج اُٹھتا ہے جنگل

بسیروں پہ چڑیاں سمیٹے ہیں بازو گھنی جھاڑیوں میں دبکتے ہیں آہو

درختوں میں جا جا کے چھپتے ہیں جگنو اُلجھتے ہی جاتے ہیں ظلمت کے گیسو

درختوں کے پتے ہیں کیا کھڑکھڑاتے!

زمیں پہ ہیں کیا ٹہنے پھٹ پھٹ کے آتے!

درختوں پہ آتے ہیں جھونکے ہوا کے تھپیڑے ہوا دے رہی ہے بلا کے

سبھی بس میں ہیں یادِ وحشت فزا کے ستم ہر طرف ہو رہے ہیں صبا کے

نہیں وحشیوں کی بھی آواز آتی
خبر کون لے اس دم آفت زدوں کی

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن وہ مردِ مسلماں
پھر اٹھو کریں کھاتا اُفتاں وخیزاں
بہت جا پہ پنچ پنچ گئے اُسکے داماں
ہوے پار تلووں سے خارِ مغیلاں

غرض جس جگہ وہ مصیبت کا مارا
پڑا تھا۔ گیا اور جا کے پکارا

کہ "اے مبتلائے غم و رنج و آفت!
اِدھر ہاتھ لا۔ اب نہیں اتنی مہلت
کہ ٹھہریں یہاں۔ دیکھ طوفاں کی حالت
جو پانی ابھی پڑنے لگا ہو گی دِقت

ذرا صبر کر۔ اور چل میرے گھر میں
غنیمت سمجھ اُس کو ایسے سفر میں۔

اگرچہ پڑا تھا وہ بے تاب و بیدم
مگر سسکیاں بھر کے۔ با چشمِ پُرنم
اُٹھا۔ اور کہا "اے مرے دل کے مرہم!
فرشتہ ہے تو؟ یا کہ از نسلِ آدم؟

تھی تیری ہی جرأت۔ اس آفت میں آنا۔
غریبوں کو حسرت زدوں کو بچانا"

یہ بولا جوانمرد "اے سینہ بریاں!
میں ہوں اک غریب اور بے مایہ انساں
کیا مجھ کو دُنیا نے از حد پریشاں
کہوں کیا" (مگر دیکھ کر زورِ طوفاں)

لگا کہنے "کہدوں گا پھر حال سارا
چل اب۔ ورنہ ہو جائے گا حشر برپا"

پھر اک دوسرے کو پکڑ کے وہ باہم
نظر کرتے ہر سمت ڈر ڈر کے پیہم
غم و رنج بہلاتے باتوں میں ہر دم
چلے دیکھتے ابر و طوفاں کا عالم

بہت ٹھوکریں کھا کے پہونچے وہاں پہ
جہاں اُس اُنہیں غریباں کا تھا گھر

جو دیکھا۔ تو اک ٹوٹا پھوٹا مکاں تھا
گذشتہ ترقی کا اُجڑا نشاں تھا
سماں ہر طرف حسرتوں کا عیاں تھا
ہر اک اینٹ کے دل سے اٹھتا دھواں تھا

مٹی جاہ و حشمت تھی دیوار و در سے
نکلتی تھیں آہیں چھتوں کے جگر سے

جوانمرد نے کھولا دروازہ بڑھ کر　　پھر اس غمزدہ کی طرف پھیر کر سر
کہا "اے جفاکش - دل افگار مضطر　　اب آرام کر دو گھڑی چل کے اندر"
ادا کر کے شکریہ وہ زار و بے دل
ہوا اپنے ہمدرد کے گھر میں داخل
وہ ہمدرد صحرانشیں بھی پھر آیا　　چراغ آندھی سے بجھ گیا تھا۔ جلایا
چٹائی پہ مہماں کو اپنے بٹھایا　　پھر اک چیتھڑا لا کے آگے بچھایا
غریبی کا کھانا۔ تکلف سے لا کر
کہا "لے جو دے تجکو میرا مقدر
وہ شہروں کے کھانے۔ وہ کھانے کی لذات　　وہ نعمت کے خواں۔ وہ غذاؤں کی کثرت
وہ باغوں کے میوے۔ وہ ہر روز دعوت　　وہ دولت کے کھیل۔ اور وہ سامانِ راحت
نہیں اُن میں سے کوئی شے یاں مہیا
جو حاضر ہے۔ ہے سب یہ نخچیر کا ہدیا
رہے اب نہیں یاں تکلف کے ساماں　　کبھی خوب رونق پہ تھا یہ بیاباں
تر و تازہ سرسبز تھا اک گلستاں　　یہاں کرتے ہر دم تھے بلبل غزلخواں
بہار اِن درختوں پہ تھی کس بلا کی!
نظر آتی تھی اِن سے قدرت خدا کی!
یہ ٹیلے جنھیں بجلی اکثر چمک کر　　دکھاتی ہے ایسے مکانات جن پر:
گماں قصرِ جنت کا ہوتا تھا اکثر　　عمارت نہ دنیا میں تھی جن سے بہتر
کبھی تھے یہی منظر ہاو اے عالم
کبھی تھے یہی مرجعِ شام و دیلم
ہر اک علم کے باکمال۔ اور یکتا　　ہر اک فن کے مشتاق اور اُسکے جویا
ہنرمند۔ صناع۔ ادیب اور اطبا　　مہندس۔ منجم۔ حکیم اور دانا
جوان مرد۔ جنگ آزما۔ مرد میداں
سبھی قسم کے لوگ آباد تھے یاں
"کمالوں سے دنیا میں تھی اُنکی عزت　　وہ رکھتے تھے تلوار سے اپنی وقعت

نہ وہ لوگ تھے۔ اور نہ وہ اُنکی شہرت
یکایک کچھ ایسی پڑی اُن پہ آفت
جو کچھ رہ گئے تھے وہ نکلے پریشاں
کہ افلاس کا پوچھیں غیروں سے درماں
مصیبت ہے، آفت ہے، ٹوٹا مکاں ہے۔
اب اک ہیں ہوں حسرت ہے غم کا سماں ہے
زمانہ عدو ہے۔ خلاف آسماں ہے۔
ہر اک سمت سے صورتِ غم عیاں ہے
کہاں تک کہوں؟ جانے دو۔ فائدہ کیا؟
تناول کرو۔ نام لے کر خدا کا۔"
لگے کھانے وہ دونوں غمگین و مضطر
یہ کہہ کر گیا خود بھی بیٹھ۔ اور دل کر
جھکا یا مسافر نے یکبارگی سر
یکایک خدا جانے کیا گزری دل پر؟
نظر کی جو جھک کر۔ تو آنسو رواں تھے
جو غم دل میں مخفی تھے رُخ سے عیاں تھے
رہی ضبط کی میزباں میں نہ طاقت
نظر آئی جب میہماں کی یہ حالت
بہت کھا کے ترس اور بہ آوازِ شفقت
بڑے غور سے دیکھ کر اُسکی صورت
یہ بولا کہ "اے بختِ برگشتہ مہماں!
بیاں حال کر۔ کون ہے؟ کیوں ہے حیراں؟
کہ کچھ رنج پہونچا ہے چرخِ کہن سے؟
"نکالا کسی غم نے تجھ کو وطن سے؟
چھٹا یا کہ معشوقِ پیماں شکن سے؟
ہے آوارہ یا مفلسی کے محن سے؟
بتا۔ اس قدر کیوں ملول اور حزیں ہے؟
ہے کیا رنج؟ کیوں سخت اندوہگیں ہے؟"
"کہوں کیا؟ ہوئے ٹکڑے ٹکڑے جگر کے!
رہا پہلے چپ۔ پھر کہا ضبط کر کے
تجسس میں پھرتا ہوں اک سیمبر کے
بتاؤں میں کیا حال اپنے سفر کے
زمانہ مجھے کہتے ہیں۔ بے نوا ہوں
نہیں ہائے ملتا جسے ڈھونڈتا ہوں"
زمانہ! ہے یہ نام مشہورِ دنیا!
تعجب سے گھبرا کے ہمدرد بولا
نکلنا تمھیں کیوں پڑا؟ کیا ہوا کیا؟
تمھیں ہو! نہایت ہی حیرت کی ہے جا!

وہ تھا کون دلبر؟ کہاں تھا؟ کہاں ہے؟
کہاں رہتا ہے؟ نام کیا؟ کیا نشاں ہے؟

سوالوں کا سننا تھا کیا۔ اک بلا تھا۔   رہا ضبط کا پھر نہ یاں میں یارا
لگی شیشۂ دل میں اک ٹھیس گویا   بہت زور سے رویا اور رو کے بولا

بیاں کیا کروں ماجرا اپنے غم کا!
کہوں حال کیا اپنے رنج و الم کا!

کوئی گیارہ سو سال گذرے کہ میرا   گذر ایک جا اتفاقاً ہوا تھا
کہوں کس طرح ہائے عالم وہاں کا!   عجب شہر تھا! اور عجب اسکا نقشا!

خدائی کا ساماں تھے واں فراہم
عجب دھوم دھام اس میں رہتی تھی ہر دم

عمارات عالی کی وہ شانداری   وہ باغوں کی رونق۔ وہ باد بہاری
ہرے پودھوں کے نیچے نہریں جاری   وہ اونچے محل انکی وہ استواری

نظر میں مری پھرتا ہے وہ سماں اب
ملیگا وہ افسوس ساماں کہاں اب؟

تھی اس شہر کے بیچ میں اک عمارت   بلند اور خوش وضع۔ باشان و شوکت
حواس اڑتے تھے دیکھکر اسکی عظمت   دلوں پر اثر کرتی تھی اسکی عظمت

تھا اس قصر عالی کا گنبد سنہرا!
اڑا کرتا تھا جس کے اوپر پھریرا

ممالک تھے سب زیر فرماں اسکے   دہلتے شہنشاہ تھے اسکے ڈر سے
جھکائے تھیں سب قومیں سر اسکے آگے   مذاہب تھے جو دست بستہ کھڑے تھے

ہوا بندھ گئی تھی زمین و زماں میں
تھی اک دھاک سی بیٹھی سارے جہاں میں

وہ تخت عجم اور اقبال کسرے   وہ تہذیب یوناں۔ اور تاج روما
وہ اسپین اور اسکے شاہوں کا رتبا   اجیپٹ[عہ] اور وہ دبدبہ قبطیوں کا

سب خاک میں مل گئے۔ جب فلک پر

عہ مصر

چمکنے لگا اس پھریرے کا اختر

وہ جھنڈا تھا جس قصر پر سایہ افگن   کھلا سامنے اسکے تھا ایک گلشن
بچھا اس میں تھا ایک تخت مزین   کھڑے دست بستہ تھے سب دوست دشمن
تھی اک نازنیں تخت پر نور افشاں
پڑا ساری دنیا پہ تھا جس کا داماں

غضب حسن تھا اس بت دلربا کا   تھا اس روئے تاباں سے اک رعب پیدا
کھڑا آگے اقبال تھا دست بستا   جبیں پر تھا اک خوشنما تاج رکھتا
چمکتے تھے حرف اس میں ہیرے سے بڑھکر
"ترقی اسلام" لکھا تھا اس پر

جو میں دیکھی وہ شکل۔ وہ پیاری صورت   کہوں کیا کہ کیا ہو گئی میری حالت
رہی ضبط کی تاب مجھ میں نہ جرأت   گوارا ہوئی پھر نہ اس بت کی فرقت
غلاموں میں اسکے ہوا میں بھی داخل
ہوا خواہوں میں ہو گیا اسکے شامل

رہا مدتوں میں غلام اسکے در کا   ہوا شوق پھر سیر کا دل میں پیدا
لیا چھوڑ اسے میں نے یورپ کا رستا   بہت روزوں دیکھا وہاں کا تماشا
وہیں تھا کہ وہ نازنیں یاد آئی
تلاش اسکی اس دشت میں کھینچ لائی

خدا جانے وہ قصر و باغ اب کہاں ہے   وہ صورت کہاں! وہ شکر لب کہاں ہے
وہ عیش اور وہ اقبال کی شب کہاں ہے   جلال۔ آبرو۔ دبدبہ۔ سب کہاں ہے
خدا جانے وہ قصر ہے؟ یا نہیں ہے؟
اگر ہے تو بیشک کہیں پر یہیں ہے"

یہ سن میزباں نے بس اک چیخ ماری   پکڑ دل کو کرنے لگا آہ و زاری
ہوئی شکل پر اسکی حسرت سی طاری   کہا رو کے پھر "ہائے قسمت ہماری!
مرے دوست۔ وہ قصر عالی یہی ہے۔
وہ گلزار فرخندہ حالی یہی ہے!

گئے لوگ سب یاں سے ہوکر پریشان رہا میں ہوں بس اور یہ جاے ویراں
یہ سُن کر بہت رویا وہ غم کا ماراں ملے اُٹھ کے پھر دونوں باچشم گریاں

وہ دونوں اب اُس دشت میں رو رہے ہیں
تباہی کی گرد اشکوں سے دھو رہے ہیں-

مسلمانو! افسوس-عبرت کی جا ہے زمانہ غمِ قوم میں مبتلا ہے
تمہیں ڈھونڈھتا دربدر وہ پھرا ہے بڑی مشکلوں سے لگایا پتا ہے

بہت رو چکے رونے والے-اُٹھو اب
زمانہ جو کہتا ہے وہ ہی کرو اب

بلینک ورس یا نظمِ غیر مقفّٰی

یہ تو ہم گذشتہ نمبر مین بتا چکے ہیں کہ آیندہ سے دلگداز کی توجہ نظم کی طرف بھی رہے گی-مگر وہی نظم جو معنی خیزی کی شان رکھتی ہو-جس کی غرض محض تناسب الفاظ اور قافیہ پیمائی نہ ہو-دلگداز کا یہ نمبر گذشتہ نمبر کے بعد اتنی جلدی مرتب کیا گیا کہ جادو بیان شعرائے ملک کو طبع آزمائی کا موقع نہین مل سکا-اور اسی وجہ سے ہم آیندہ کے لیے بھی وہی پہلا سبجکٹ "امید" قائم رکھتے ہین-

سردست ہم نظم کی ایک نئی قسم کی طرف توجہ کرتے ہین جو انگریزی مین تو بکثرت موجود ہے مگر اُردو مین بالکل نئی اور عجیب چیز نظر آئے گی-مشرقی شاعری مین ردیف و قافیہ بہت ضروری اور لازمی خیال کیے گئے ہین-مگر انگریزی مین ایک جداگانہ وضع کی نظم ایجاد کی گئی ہے جسے "بلینک ورس" کہتے ہین-اُردو مین اُس کا نام اگر "نظم غیر مقفّٰی" رکھا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا-اصل یہ ہے کہ قافیہ وغیرہ کی قیدین کلام کو محدود اور طبع آزمائی کے میدان کو نہایت ہی تنگ کر دیتی ہین-اگر کوئی ڈراما یا مختلف لوگون کی گفتگو نظم مین ادا کرنی ہو تو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہر فقرہ یا ہر خیال جس طرح بنے ہر مصرع

یا ہر شعر میں ختم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قید کے ساتھ کلام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ قافیہ سلسلہ کلام کو ہمیشہ قطع کر دیا کرتا ہے۔ اسی مجبوری سے انگریزی میں خاصۃً ڈراما کے لیے یہ نظم غیر مقفیٰ ایجاد کی گئی جو یہ شان دکھاتی ہے کہ ایک طرف تو کلام برابر موزون ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف سلسلۂ کلام یوں جاری رہتا ہے کہ اگر مصرع مصرع جدا کر کے نہ لکھیں تو معلوم ہو کہ گویا بے تکلفی سے نثر میں گفتگو ہو رہی ہے۔ صرف یہی چیز ہے اور یہی نظم ہے جس نے شیکسپیر اور دیگر شعرائے یورپ کو شہرت کے دربار میں سب سے معزز جگہ دی ہے۔

بعض انگریزی دان نوجوانوں نے کئی مرتبہ اُردو میں نظم غیر مقفیٰ کے کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور ناکامی کی وجہ یہ ہوئی کہ سوا قافیہ کی قید چھوڑ دینے کے اُنھوں نے اس نظم کی دوسری خوبیاں اور اصلی ضرورت دکھانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ شاید اگر وہ کسی ڈراما یا گفتگو کو نظم کرتے اور کلام کی بے تکلفی و روانی کے قائم رکھنے کی کوشش کرتے تو ممکن نہ تھا کہ اہل سخن پسند نہ کرتے۔

لہذا ہم اب اس جانب توجہ کرتے ہین اور بالکل اُسی انگریزی شان سے ایک موزون ڈراما لکھنے کی بنیاد ڈالتے ہین۔ اگر ملک نے توجہ کی اور اہل سخن نے پسند کیا تو پورے سین موزون کر دیے جائین گے۔ ورنہ دو ہی تین سین موزون کرنے کے بعد یہ سلسلہ چھوڑ دیا جائے گا۔ اسوقت ہمارا مقصود صرف اس قدر ہے کہ بلینک ورس یا نظم غیر مقفیٰ کو اُس کی اصلی شان مین دکھا دین۔ تاکہ جن اہل سخن کو پسند آئے وہ بھی ایسی ہی نظمین لکھین۔ اور ہم سے زیادہ بے تکلفی۔ سادگی۔ اور کمالات شاعری دکھائین۔

ہم اپنے قدردانون اور لائق جادو نگارون سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ اپنی معزز راؤن سے ہمین ضرور مطلع فرمائین تاکہ اُردو شاعری کی دنیا مین اس نظم کے مناسب ہونے یا نہ ہونے اور مقبولیت عام حاصل کر سکنے یا نہ کر سکنے کا اندازہ کیا جا سکے۔ اب ہم بکمال ادب پبلک کے

دربار میں یہ نئی نظم اور یہ عجیب قسم کا ڈراما پیش کرتے ہیں -

پہلا سین

آبنائے جبرالٹر کے جنوبی ساحل پر ملک مراکو کے قدیم شہر سبطہ کا شاہی قصر جو لب ساحل واقع ہے

اشخاص

شاہ جولین فرمان روائے سبطہ - اُس کے درباری - مصر کا ایک نووارد مسیحی شخص - فلورنڈا جولین کی بیٹی - چوبدار -

سین

جولین اپنے قصر سے ایک جہاز کو آکے ٹھہرتے اور اُس سے مصر کے ایک نووارد مسیحی شخص کو اُترتے دیکھ کے اہل دربار سے باتیں کرتا ہے -

جولین
کون ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اور کیا ہے آنے کی غرض؟
کس لیے آیا ہے؟ اور کس کا ہے یہ سادہ جہاز؟
گو سمجھ میں کچھ نہیں آتا - مگر حیرت سی ہے -

ایک درباری
میں تو کہتا ہوں کہ حضرت کوئی عیسائی فقیر
مانگنے آیا ہے

جولین
لیکن وضع سائل کی نہیں

دوسرا درباری
مصر یا قرطاجنہ کا کوئی سوداگر نہ ہو؟

جولین
شاید ایسا ہی ہو - لیکن جو ہو آنے دو یہاں
خود ہی حال اپنا بتا دے گا یہ میرے سامنے
(چوبدار آتا ہے)

چوبدار
اجنبی سیاح اک اُترا ہے ساحل پر حضور
آرزو ہے باریابی کی اُسے

جولین
لاؤ ابھی
(چوبدار جاتا ہے)

پہلا درباری — خوف یہ ہے کہ فرعون کا کوئی گویندہ نہ ہو

جولین — اب تو جو ہو میں لئے آنے کی اجازت ہی اُسے

(ایک شخص سوداگروں کے لباس میں آتا ہی)

پہلا درباری (زمین چوم کے) — آسمان پھرتا ہے جب تک اور جب تک آفتاب
نور برساتا ہے اس تاریک سطحِ خاک پر۔
دیں اُس مصلوب بیٹے کا خدا کے جس گھڑی
تک ہے غالب سارے اُن دینوں پہ جو
ظلم کی تعلیم دیں۔ اے بادشاہ بحر و بر
اُس گھڑی تک تو رہے حامی مسیحی دین کا۔

جولین — خیر۔ یہ تمہید چھوڑو۔ اور بتاؤ تم کہاں
سے یہاں آئے ہو؟

شخص — اے حامیِ تثلیث و صلیب!
یہ غلام آتا ہے ارضِ مصر سے سیدھا ادھر

جولین — اور غرض آنے کی؟

شخص — یہ وحشت خبر۔

جولین — کیسی خبر؟

شخص — جس سے سب مصری مسیحی ہیں پریشان و حزیں۔

جولین — کیا خبر ہے وہ؟

شخص — کروں گا عرض خلوت میں اُسے۔

جولین (ذرا سوچ کے) — خیر بہتر
(سب اہل دربار سے) — اے مرے سردارو ہٹ جاؤ ذرا
(سب چلے جاتے ہیں)
(شخص سے) — لو کہو وہ کیا خبر ہے؟
عرض یوں ہے اے حضور
اک نئی فوجِ عرب آتی ہے ملکِ شام سے

تا کہ سبطہ پر کرے حملہ

جولین (لاپروائی سے) مجھے پروا نہیں
دو شکستیں دے چکا ہوں جس طرح موسیٰ کو میں
اور جس ذلت سے بھاگے اُسکے بودے جنگجو۔
ویسے ہی بھاگیں گے یہ شامی سپاہی بھی جو یہیں
میرے جاں بازوں کا دھاوا ہوگا زور و شور سے۔

شخص اِس میں کیا شک۔ لیکن اس فوج عرب کے آخری
حملے میں ہے بیحیائی کی غرض۔ یعنی کہ وہ
چاہتے ہیں (زباں رُک جاتی ہے)

جولین کیا؟

شخص نہیں جرأت ہی اُسکے عرض کی۔
اُن کی بے شرمی کی نیت کو کوئی کیونکر کرے
ظاہر ایسے شاہ کے آگے؟

جولین کہو بے خوف تم۔

شخص جان کی گر ہو اماں۔

جولین تم کو اماں ہے۔

شخص (ہاتھ جوڑ کے) تو حضور
یہ غلام باوفا یوں عرض کرتا ہے بہ عجز
تاجدار شام کے بھائی کا اک نامی غلام
سُنکے شہرہ شاہزادی فلورنڈا کے حُسن
کا ہوا بیتاب اس حد تک کہ لے کر فوج کو
اور اجازت لے کے آقا سے چلا ہے اس طرف
تا کہ گھیرے شہر سبطہ۔

ع۔ موسیٰ بن نصیر ولید بن عبدالملک خلیفۂ اموی کا سپہ سالار۔ پہلا عربی فاتح افریقیہ۔ اور پہلا گورنر افریقیہ۔

جولین (غصہ سے) کیا مجال اُسکی کہ پاس
بھی ہمارے آسکے۔

شخص لیکن ادھر سے بھی حضور
فوج لے کر آئے گا موسیٰ کمک پر اُسکی جب
ہوگی دشواری

جولین نہیں پروا مجھے اسکی بھی کچھ
لیکن اس میں کیا تامل ہو کہ اُن کے آنے سے
پیشتر شہزادی زہرہ جبیں جائیں چلی
اُندلس میں یا کسی ایسی جگہ جس جا عرب
جا نہ سکتے ہوں

جولین تو اچھا بھیجدوں گا میں اُسے
قصر میں رزریق کے جس جا رہا کرتی ہیں سب
بیٹیاں اچھے امیروں کی

شخص تو جلدی بھیجیے۔
شاید آ پہونچیں عرب

جولین میں بھیجتا ہوں آج ہی
اور کچھ کہنا تو اب تم کو نہیں

شخص بس کچھ نہیں۔

جولین جاؤ۔ اور جب تک ہو سبطہ میں مرے مہماں ہو
(شخص آداب کرکے جاتا ہے۔)

(پکارتا ہے) کوئی ہے؟

چوبدار حاضر۔

جولین فلورنڈا کو لاؤ یاں ابھی
(خدمتگار جاتا ہے)

(خود بخود) گرچہ مجھکو خوف ان وحشی لٹیروں کا نہیں۔

اور ہے اُمید خاتون معظم[1] سے کہ میں
پہلے ہی میدان میں دونگا شکست ان لوگوں کو
مصلحت لیکن یہی معلوم ہوتی ہے کہ اب
میں فلورنڈا کو بھیجوں ٹالڈو[2] کے قصر میں
(فلورنڈا آکے ایک سادگی سے کھڑی ہو جاتی ہے)

فلورنڈا (زمیں چوم کے) کیوں کیا ہے مجکو یاد اے باواجان؟

جولین اے میری ٹُن
جانتی ہے تو مجھے کیسی محبت ہے تری
اور بے تیرے نہیں ہے لطف جینے کا مرے
سب نے اپنی بیٹیوں کو قصر میں اسپین کے
بے تکلف بھیجا ہے لیکن مجھے ہرگز نہیں
یہ گوارا تھا کہ تجھ سی لاڈلی اور پاک دل
بیٹی کو بھیجوں وہاں۔

فلورنڈا کیوں؟

جولین اسلیے اس ملک میں
ایک غاصب شخص کا قبضہ ہے تاج و تخت پر
اور تو ہے خاص شاہی نسل قوم گاتھ[3] سے
جسکے گھر کا رادورق بھی تھا کبھی ادنیٰ غلام
لیکن اب مجبور ہوں اسپر کہ تجھ کو بھیجدوں
جتنی جلدی ہو سکے اُسکے محل میں

فلورنڈا کیا مجھے

---

[1] خاتون معظم سے مراد حضرت مریم ہیں
[2] ٹالڈو جسے عربی میں طلیطلہ کہتے ہیں یہ شہر عربوں سے پہلے اسپین کی مسیحی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔
[3] اسپین کا پچھلا مسیحی گاتھ قوم کا بادشاہ جسکے قدیم شاہی خاندان کو تاج و تخت سے محروم کرکے رادورق نے سلطنت پر قبضہ کرلیا تھا۔

وہ بُلاتا ہے؟

جولین
نہیں۔ لیکن مسلمانوں کی فوج
آتی ہے مشرق سے۔

فلورنڈا
آئے تھے کبھی پہلے بھی وہ

جولین
ہاں مگر پہلے وہ خواہاں فتح کے تھے اور اب
چاہتے ہیں تجکو لیجائیں مرے آغوش سے۔

فلورنڈا
دو شکستیں دے چکے ہیں آپ تو اب خوف کیا
ہے کہ یہ لونڈی جدا ہو آپ سے؟

جولین
صرف احتیاط
ورنہ مجکو یقیں ہے بھاگے گی فوجِ عرب
جیسے ہی حملہ کریں گے میرے نامی پہلواں

فلورنڈا
تو مجھے کیوں بھیجتے ہیں آپ واں؟

جولین
یہ خوف ہی
اک طرف بڑھتا ہوں میں اور دوسری جانب سے وہ
کرکے یورش تجکو لے جائیں نہ

فلورنڈا
زندہ؟ کیا مجال!
لاش میری جائے گی!

جولین
یہ بھی تو مجکو خوف ہے۔
اور اسی سے بھیجتا ہوں واں تجھے

فلورنڈا
لیکن وہاں
راڈرک کا خوف ہے جو بے حمیت۔ بے حیا۔
دشمنِ عصمت۔ نہایت ظالم و مغرور ہے۔
آبرو لے گا مری—

جولین
اتنی نہیں اُسکی مجال۔
گر کیا ایسا تو کھوئے گا وہ اپنا تاج و تخت

اب نہیں ہو وقت کچھ انکار کا بس آج ہی
تو روانہ ہو یہاں سے۔ اور اُسکے قصر میں
جا کے رہ آرام سے۔ لیتا رہوں گا میں خبر
گر ذرا بھی بے رخی اُس سے ہوئی ظاہر تو میں
تجکو بلوالوں گا۔ اور دوں گا اُسے ایسی سزا
جو رہے گی یاد

فلورنڈا
مجکو عذر کیا۔ جاتی ہوں میں
چھوڑ دوں گی آج ہی گھر بار کو
(بغلگیر ہو کے) اور آپ کو
(فلورنڈا روتی ہوئی جاتی ہو۔ اور پردہ گرتا ہے)

---

(۲)

اس نظم کے متعلق ہمارے پاس عجیب مختلف مذاق کے خطوط آئے ہیں لکھنؤ کے پُرانے شعرا نا پسند کرنا درکنار اسے نظم ہی نہیں تسلیم کرتے۔ لیکن انگریزی مذاق کے قدردانوں نے ہر جگہ پسند کیا۔ اور تاکید کر رہے ہیں کہ جو ڈراما ماہ جون کے دلگداز نمبر ۶ جلد ۷ میں شروع کیا گیا ہے ضرور ختم کیا جائے۔ بعض قدر افزاؤں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہمیں ہمت دلائی ہے۔ اور یہاں تک لکھدیا ہے کہ ہم مخالفت کی بالکل پروا نہ کریں۔ علی الخصوص خواجہ نور محمد صاحب نے جو کلکتہ کے ایک کالج میں بی اے کی تعلیم پا رہے ہیں ایک پُر جوش اور مدلل خط لکھ کے ہمارا حوصلہ بڑھانے کی بے انتہا کوشش کی ہے۔ ہم اُن کا خط شایع کر دیتے۔ مگر افسوس دلگداز میں اتنی گنجایش نہیں ہے۔

بہر تقدیر اگرچہ ہم نے ابھی تک ڈراما کے ختم کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اس پرچے کے ذریعے سے ایک اور سین نذر ناظرین کرتے ہیں۔ اور امید ہے کہ احباب مکرر غور فرما کے دوبارہ اور زیادہ استقلال سے اپنی رائیں قائم

کریں گے۔ اگر انھوں نے پسند کیا تو ہم اس قسم کی نظم کا سلسلہ زیادہ محنت اور زیادہ خوش اسلوبی سے جاری رکھیں گے۔

دوسرا سین۔ آدھی رات

اشخاص

راورق۔ شہنشاہ اسپین۔ فلورنڈا۔ جولین کی بیٹی۔ مریم۔ فلورنڈا کی ماموں زاد بہن۔ راورق کی ساقیہ۔ حبشی راورق کے دربار کا جلاد۔

سین

دار السلطنت اسپین ٹالڈو میں راورق کے محل کا ایک کمرہ۔ فلورنڈا کا خوابگاہ۔

حالت

فلورنڈا اکیلی اپنی خوابگاہ میں ایک کرسی پر متردد بیٹھی ہے۔ سامنے مشرق کی طرف ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور وہ گھبرا گھبرا کے کہہ رہی ہے۔

فلورنڈا

کس غضب میں پڑ گئی ہوں! آہ! کچھ بتانہیں!\
کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ کیونکر بچوں؟ اور کون ہے\
جسکے آگے سر کو دے ماروں؟ یہاں کوئی نہیں\
جو خبر لے اِس مصیبت میں مری۔ افسوس! میں\
پھنس گئی کیسی بلا میں؟ میں تو آتی ہی نہ تھی۔\
آہ! والد نے نہ مانا! دیکھیے قسمت میں اب\
کیا لکھا ہے؟ اور کیسی ذلتیں ہوتی ہیں؟ اے\
راورق ظالم تجھے کچھ شرم بھی آتی نہیں؟\
مر نہیں جاتا ہے کیوں؟ جو تیرے ظلموں سے بچیں\
لڑکیاں شاہی گھرانے اور معزز لوگوں ——

(کوئی کچھ آہٹ پا کے) کون؟

(مریم دروازہ کھول کے آتی ہے)

مریم

میں۔

فلورنڈا (نہایت متوجہ ہو کے) بتاؤ کیا ہوا؟

مریم (مسکرا کے) سب خیریت ہی رہی بہن

(حیرت سے) بچیا ئی کی ہنسی!

ہرگز نہیں۔ سُنیے تو آپ۔
گو گئی بے آبرو ہونے کو تھی۔ لیکن وہاں
مل گئی اک رحمدل خاتون۔

فلورنڈا اور وہ کون تھی؟

مریم
راورق کی ساقیہ۔ جو دیکھ کر بیکس مجھے۔
مہرباں مجھ پہ ہوئی ایسی کہ اک تدبیر سے
آبرو میری بچا لی۔

فلورنڈا (خوش ہو کے) کس طرح؟

مریم ایسے کہ وہ
جب ہوا بد مست پی پی کر تو بیہوشی کا جام
اک دیا ایسا کہ بالکل بے خبر وہ سو گیا
تب سُلا کے اُس کے پہلو میں کوئی اُسکی کنیز
یہ کہا مجھ سے کہ بھاگو یاں سے تم۔

فلورنڈا
عورت نہیں
وہ فرشتہ تھی مدد کی جس نے ایسے وقت پر۔
آسمان کی طرف سر اُٹھا کے شکر ہے تیرا خدا! اب مجکو بھی اُمید ہے
کیا عجب میری مدد بھی وہ کرے۔ اور بچ سکوں
راورق کے ظلم سے۔

(مریم کی طرف دیکھ کے) تو اے بہن جلدی کہیں
مجکو بھی اُس سے ملا دو۔ کیا عجب آئے اُسے
میری حالت پر بھی رحم۔

مریم آپ اس گھڑی وہ آئیں

سکتی ہے یاں تک مگر میں جاتی ہوں ڈھونڈھوں اُسے

فلورنڈا: جلد آنا ـــ

مریم: لاتی ہوں اُسکو ابھی گر مل گئی۔

(مریم جاتی ہے)

فلورنڈا: یا خدا قربان ہو جاؤں ترے اس رحم کے
کیسی مایوسی تھی؟ یا اب کیسی خوش ہوں بس نہیں
کوئی حامی بیکسوں کا ہے سوا تیرے - یہاں
بھیجا خود والد نے تھا جیرا مجھے - تو را ورق
کتنا بدکردار، کتنا بیحیا ثابت ہوا؟
آبرو لینے کا درپے وہ اُدھر - اور اس طرف
بن نہ پڑتی تھی کوئی تدبیر - تب گھبرا کے ایک
آدمی کو میں نے دوڑایا کہ سبطہ میں کرے
جاکے والد کو خبر - اور وہ بُلالیں مجکو جلد -
کچھ پتہ اُس آدمی کا بھی نہ تھا - حیران تھی -
ایسی مایوسی میں لے بیٹے خدا کے - اور اے
پاک خاتونِ معظم تم نے کی آسان ہے
میری مشکل -

(مریم آتی ہے اور ساقیہ اُسکے ساتھ ہے)

مریم: ڈھونڈھ لائی ہیں انھیں

ساقیہ (ہاتھ جوڑ کے): حاضر ہوں میں
شاہزادی - حکم کیا ہے آپ کا؟ ارشاد ہو -

فلورنڈا: آبرو میری بچالو -

ساقیہ: گرچہ یہ دشوار ہے
میں مگر کوشش کروں گی

مریم (افق مشرق کو دیکھ کے): صبح اب ہونے کو ہے -

دیکھئے جھونکے نسیمِ صبح کے وہ آپکی
زلف برہم کر رہے ہیں اور تاروں کے چراغ
جھلملاتے ہیں فلک پر۔ اور سیہ چادر شب
کی مسکتی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو چڑیاں اٹھیں
اور جگا دیں لراورق کو۔ میں تو جاتی ہوں بہن۔

فلورنڈا کیا کروگی جاکے اب؟

ساقیہ ان کو نہ روکیں

فلورنڈا کس لیے؟

ساقیہ بادشہ کو گر ذرا بھی شک ہوا تو بس سمجھے
اور ان کو قتل کر ڈالیں گے۔

فلورنڈا (آنسو بہا کے) تو جاؤ بہن۔
اب کہاں جاؤ گی تم؟

مریم جس جا خدا لیجائے

فلورنڈا تم
کس طرح جاؤ گی یاں سے؟

مریم خاک اڑاتی۔ ٹھوکریں
کھاتی۔ ننگے پاؤں۔ جاؤنگی بہن۔ اور جس طرح
بن پڑے گا۔ آپ کو پہونچاؤں گی۔ زبون میں۔

ساقیہ کیوں نہیں جاتی ہو سبطہ میں؟ جہاں آرام سے
قصر میں اپنے پھوپھا کے زندگی بھر رہ سکو

مریم خیر جاؤں گی وہیں

فلورنڈا لیکن وہاں تو ان دنوں
ہوگی یورش کافروں کی ہر طرف۔ اور کوئی شخص
جا نہ سکتا ہوگا اندر شہر کے

مریم میں جاؤنگی جیسے بنے

فلورنڈا تو مرا سب حال کہدینا۔

ضرور

فلورنڈا — اور یہ کہ اب

مجکو واں جلدی بُلا لیں

مریم — لو خدا حافظ بہن۔

(مریم جاتی ہے)

فلورنڈا (رو رو کے) — اک بہن یاں مل گئی تھی۔ وہ بھی آخر چھٹ گئی۔

گو کہ پہلے ہی زمانے کی ستائی تھی مگر

کھینچکر لائی گئی دینے کو اپنی آبرو

خیر تو وہ بچ گئی۔

ساقیہ (تشفی دینے کے لہجے میں) — یوں ہی بچیں گی آپ بھی۔

صبر کیجیے شاہزادی۔ اور نہ اب گھبرائیے۔

میں تو خدمت کے لیے حاضر ہوں گر مریم نہیں؟

اُن سے زیادہ میں مدد دونگی ہمیشہ۔

فلورنڈا — ظلم ہے

راورق کے ہیں بچوں دشوار ہے۔

ساقیہ — دیکھیں تو آپ

کیسی حکمت سے بچاتی ہوں۔ مجھے اک خوب چیز

ہاتھ آئی ہے۔ جہاں اک جام اُس کا دے دیا

بس نہیں رہتی ہے اُن کو دین و دنیا کی خبر۔

یوں ہی مریم کو بچایا۔ اور یوں ہی آپ کو

ہاتھ سے اُنکے بچا دوں گی۔

(ناگہاں دروازہ کھلتا ہے۔ اور راورق غصے میں بھرا ہوا آ جاتا ہے)

راورق — یہ کیا سنتا ہوں میں!

(ساقیہ سے) — تُو اور ایسی نابکار! اچھا ٹھہر! جلد ہی بتا

کیا ہوئی مریم؟ کہاں ہے وہ؟

ساقیہ۔ (قدموں پر گر کے) نہیں محبکو خبر

راورق سب شرارت ہے تری قطامہ!

(پکار کے) کوئی ہے یہاں؟

(ایک حبشی ننگی تلوار لیے ہوے آتا ہے)

سر اُڑا دو اس کا لیجا کر

ساقیہ (قدموں پر لوٹ کے) خطا ہوا اب معاف

پھر قصور ایسا نہ ہوگا

راورق تو ابھی مریم کو لا۔

ساقیہ اُسکا ملنا تو نہیں ممکن ہے اب

راورق تو قتل ابھی

(فلورنڈا کی طرف دیکھ کے) ہوگی تو اور لوں گا میں بدلا فلورنڈا سے ۔بس

چل ابھی تو ساتھ میرے۔ اور دیکھوں کس طرح

یہ بچا لیتی ہے تجکو آج میرے ہاتھ سے

(ساقیہ کو حبشی۔ اور فلورنڈا کو راورق زبردستی کھینچ لیجاتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

(۳۳)

اس پرچے میں ہمارا ارادہ نہ تھا کہ اس ڈراما کا کوئی حصہ شایع کریں۔ بلکہ پرچے کے لیے بعض اور مضامین مرتب کیے جا چکے تھے لیکن بعض قدردان بااقتدار احباب نے تاکیدی خطوط بھیج کے اس قدر اصرار کیا اور یہاں تک مجبور کیا کہ ہم ایک نثر مضمون کو نکال کے اس ڈراما کو خوشی کے ساتھ شایع کرتے ہیں۔ فی الحال معزز اڈیٹر پنجاب آبزرور اور مسلم کرانکل وغیرہ کے رائیں بھی کچھ ایسی موافقت میں دیں کہ تعلیم یافتہ جماعت میں زیادہ شوق پیدا ہوگیا۔ اور اب یہ مناسب ہوگا کہ یہ سلسلہ جہاں تک ہو پورا کیا جائے اور دلگداز میں آخر تک تھوڑی بہت اس قسم کی نظم ضرور شایع ہوتی رہے۔

تیسرا سین۔ آدھی رات

اشخاص

کونٹ جولین حاکم سبطہ۔ افسران فوج۔ گاکیس فلورنڈا کا غلام۔

سین

قلعۂ سبطہ۔ جبکہ عرب اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ کونٹ جولین کی خوابگاہ۔

حالت

کونٹ جولین ایک بچھونے پر تنہا لیٹا سو رہا ہے۔ سوتے سوتے کچھ شور سُن کے چونک پڑتا ہے گھبرا کے اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اور آپ ہی آپ کہہ رہا ہے۔

جولین (فکرمندی و پریشانی کی شان) شور یہ کیسا ہے! کیوں غل ہو رہا ہے! کیا عرب
اس طرف بھی آ گئے؟ لیکن نہیں۔ ساحل پہ یاں
کون آ سکتا ہے ان میرے جہازوں کی فصیل
توڑ کے؟

(کچھ آہٹ پا کے) کون؟

(چند افسرانِ فوج ایک شخص کو پکڑ کے لاتے ہیں)

افسر آپ کے خادم

جولین بتاؤ کیا ہوا؟

افسر (ہاتھ جوڑ کے) خیریت۔ اقبالِ شاہی کا ستارہ ہو بلند
اور جو اس تاج کا بدخواہ ہو پامال ہو۔

جولین (ناگواری سے) کیا ہوا جلدی کہو۔

افسر بہتر حضور۔ اس اجنبی
شخص کو پکڑا ہے ہم نے جو کہ اس سناٹے میں
ایک کشتی سے اُتر کے چپکے چپکے آ گیا
تاکہ داخل ہو ہمارے قلعہ میں

جولین اس سے بھی کچھ

تم نے پوچھا تھا؟

افسر حضور اسکا بیان ہے یہ کہ یہ
شاہزادی کے غلاموں میں ہے۔ اور لایا ہے اُن
کا پیام اسپین سے سرکار میں

جولین تو کون ہے؟

(غور سے دیکھ کے) گالیس؟

غلام جی

جولین تو ہے؟ کیونکر آسکا تو ان دنوں؟

گالیس سخت دشواری سے اپنی جان پر میں کھیل کے
آیا ہوں۔ جبرالٹر میں ہفتہ بھر سوچا کیا
اور کچھ تدبیر آنے کی نہ بن آئی تو پھر
سیکھ کر میں پیرنا واں سے چلا

جولین بے کشتی کے؟

گالیس جی نہیں۔ ساتھ ایک کشتی تھی۔ مگر جب دشمنوں
نے مجھے دیکھا تو دریا میں میں کودا۔ اور بس
مارکے غوطہ بڑی مشکل سے یہاں تک پہونچا ہوں۔

جولین واقعی انعام کے قابل ہے تو۔ اچھا بتا
کیا خبر لایا ہے؟

گالیس افسروں کی طرف اشارہ کرکے) پہلے ان کو رخصت کیجیے۔

جولین (افسروں سے) یہ تمھاری ہوشیاری قابلِ تعریف تھی
خیر اب جاؤ۔

افسر ابھی

(جاتے ہیں)

جولین (گالیس سے) تبلا فلورنڈا کا حال

گالیس خیریت سے ہیں مگر جاتے ہی واں لے بادشاہ

پھنس گئیں اک سخت آفت میں

جولین وہ آفت کیا ہے بول؟

گنالیس راڈرق نکلا عجیب بدکار و ظالم اے حضور
پہلے تو اس نے بڑی خاطر تواضع کی۔ مگر
اب تو دشمن عزت و ناموس کا ہے درپے آزار ہے
آبرو لینے پہ آمادہ ہے۔

جولین (بیتاب ہو کے) ظالم راڈرق!

گنالیس شاہزادی کی ابھی تک تو بچی ہے آبرو۔
لیکن اب صورت نہیں بچنے کی کوئی۔ جلد آپ
اُن کو یاں بلوائیں۔ ورنہ خوف ہے اس بات کا
ساتھ عزت کے وہ اپنی جان بھی دیدیگی

جولین آہ!
وہ تو جاتی تھی۔ مگر میں نے اُسے بھیجا بہ جبر۔
گر اُسے صدمہ کوئی پہونچا تو میں مرجاؤں گا
زہر کھا کے مر گئی گر وہ تو یہ جانو کہ میں
اُسکا قاتل اور اُس کی جان لینے والا ہوں۔
(غصہ سے) راڈرق ملعون۔ بے دین۔ بیحیا۔ و بے نصیب
کیا ملے گا تجھکو میرا دل دکھا کے؟ آہ اب
انتقام اُس سے مل سکتا نہیں ہے ان دنوں
یاں عرب کی یورشیں ہیں اور اُدھر وہ بیحیا
عزت و ناموس کے پیچھے پڑا ہے کیا کروں
میں تو یاں اُسکے لیے دشمن سے لڑتا ہوں۔ اُدھر
وہ مری بیٹی کی عزت لے رہا ہے! خیر اب
گر مجھے دشمن بناتا ہے تو میں بھی شوق سے
اُسکا دشمن بنتا ہوں۔ ان مشرقی لوگوں سے یہ

جنگ کیوں ہے؟ بس فقط دینی حمیت کیلیے۔
ساری سبطہ کی رعایا۔ یہ بہادر۔ یہ ڈیوک۔
جان دیتے اور خون اپنا بہاتے ہیں یہاں۔
قلعۂ سبطہ گھرا ہے ہر طرف سے۔ اور آگ۔
تیر۔ پتھر۔ رات دن برساتے ہیں دشمن۔ یہ سب
محض اسکے واسطے برداشت ہم کرتے ہیں۔ یہ
وہ نہیں باز آتا اپنی حرکتوں سے۔ اور آہ!
خود مری عزت کا دشمن ہے۔ تو خیر اب صبح ہی
صلح کرلوں گا مسلمانوں سے۔ جو ہیں باوفا۔
باحمیت۔ قول کے سچے۔ بہت ہی راستباز۔
بات کے اپنے دھنی۔ سب کو ہے اُنکا اعتبار
میں بھی بنکے دوست اُن کا اور کرکے آشتی
اُن سے کہتا ہوں کہ مجھ کو اور میری فوج کو
ساتھ لے کے اندلس پہ حملہ آور ہوں۔ یونہیں
انتقام اُس سے ملیگا۔ اور میں سب ظلموں کا
اُس سے بدلہ لوں گا اپنا۔ غیطشہ کے خاندان
کے بھی آنسو پونچھوں گا دیکے سزا کمبخت کو۔
بس یہی اب ٹھیک ہے۔ اے راورق۔ رہ منتظر
اُس گھڑی کا ہنہنائیں جب عرب کے بادپا
سرزمین میں اندلس کے خوب زور و شور سے
تیرا جھنڈا اور ترا اقبال یہ پامال ہو۔
اور وہ بُرج طلسمی کا سماں پیش نظر
تیرے ہو اُس وقت میں مسرور ہونگا۔ اور سب
ظلم کے تیرے ستائے ہونگے شاداں دیکھ کر
تجکو لتھڑا خون میں تجکو تڑپتا خاک میں

(گالیس سے) خیراب لے گالیس جا کل ملوں گا صبح کو
اور بھیجوں گا کسی کو اندلس میں۔ تا کہ جلد
وہ فلورنڈا کو لائے اُس شقی کے قصر سے۔

گالیس
انتظام اسکا مگر جلدی ہو۔

جولین
میں خود چاہتا
ہوں کہ بلواؤں مگر جب تک نہ ہو گی صلح کچھ
بھی نہیں بن پڑتا ہے

گالیس
گر حکم ہو تو یہ غلام
جانے کو حاضر ہے

جولین
لیکن گالیس اس کام کے
واسطے بھیجوں گا میں اپنے امیروں کو جو عقل
سے عرب لوگوں کو راضی کر سکیں جاتے ہی واں
اور آسکے دوسرے ہی دن میں بھیجوں چند لوگ
اُندلس میں تا کہ لائیں وہ فلورنڈ کو ساتھ

گالیس
جو ہو مرضی مبارک
ہاں بس اُسکے آتے ہی
اُترے گی فوج عرب اسپین میں جو ہر طرف
لوٹیں گے اُس سرزمیں کو اور میں گھس جاؤنگا
قصر میں رزریق کے لینے کو اپنا انتقام
(گالیس سلام کرکے جاتا ہے۔ جولین پیچھے سے پڑھتا ہے۔ اور پردہ گرتا ہے)

چوتھا سین۔ سہ پہر

اشخاص

عیسیٰ بن مزاحم۔ ایک نوخیز لڑکی مریم جسے عیسیٰ فلورنڈا سمجھتا ہے۔ اور تھیوڈورا جولین کی بی بی

حالت

عیسیٰ اپنے برج سے محل کے قلعے کے اوپر دریا کے کنارے کنارے ٹہل رہا ہے اور غروب آفتاب کا تماشا دیکھتا ہے۔

عیسیٰ (خود بخود) آہ دنیا۔ تجھ میں کیا کیا لطف ہیں کس شان سے دیکھو سورج ڈوبتا ہے! اور کرنیں کس طرح پانی پر افشاں چھڑکتی ہیں! اُدھر اُس کوہسار کو طلائی کپڑے سورج نے پہنائے ہیں۔ جہاں گھانس کی وہ ننھی ننھی پتیاں اس دھوپ میں جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں۔ وہاں اس نیل نے کیا طلائی جھالریں منقش تکی لٹکائی ہیں! پھول بھی ہر رنگ کے اس جا کھلے ہیں۔ اور وہ دیکھو کلیاں مسکراتی ہیں عجب انداز سے! دیکھ کر یہ لطف چڑیاں کیسی خوش ہیں! اور کس جوش سے سب چہچہا اٹھتی ہیں! کیسی شاد ہیں! جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ! اک میں ہوں کہ دل کو قرار آتا نہیں۔ الجھن ہے۔ بیتابی ہے۔ اور ہر گھڑی اک درد ہے۔ پیاری فلورنڈا! تجھے اک نظر دیکھوں تو چین آئے۔ کہاں اپنے نصیب! میں تڑپتا ہوں یہاں۔ تو اُس کے باغوں میں سیر کرتی۔ ناز سے اٹھلاتی۔ ہنستی۔ بولتی۔ کھلکھلاتی۔ توڑتی پھولوں کو۔ پھر اُن کو عجب ناز سے سر پر لگاتی ہوگی ——

(کچھ آہٹ پاکے اور ایک آواز سن کے)

(اِدھر اُدھر دیکھ کے) کیا! یہ کون تھا؟

کس کی یہ آواز تھی؟ دلکش۔ سریلی۔ نغمہ خیز

(تھیوڈورا اور مریم آ جاتی ہیں)

(ٹھٹھک کے اور کچھ کہتے کہتے رُک کے) کون ہیں یہ؟ حوریں ہیں؟ یا پریاں ہیں؟ انکا نور تو
سب پہ غالب ہے۔ مگر ایسا نہ ہو یہ بھاگ جائیں
دیکھ کر مجکو یہاں۔ اچھا چھپا جاتا ہوں میں
اور دیکھوں آکے کیا کرتی ہیں۔

(اپنے کمرے میں چھپ کے کھڑا ہو جاتا ہے)

تھیوڈورا — بیٹی دیکھ۔ یاں
گر گھڑی بھر کو بھی آ جاؤ بہل جاتا ہے دل

مریم (دیکھتی جاتی ہے اور آگے بڑھتی جاتی ہے) — واہ وا! خوب سیریں ہیں یہاں۔ اور اس گھڑی
تو مجھے جنت سے زیادہ لطف آتا ہے نظر۔
وہ پہاڑ۔ اُنکے درے۔ سبزہ۔ درخت۔ اور دو طرف
یہ سمندر۔ اسکی لہریں۔ کشتیاں۔ اور یہ جہاز
یہ ہوا سے پھولے پھولے بادباں۔ پھر اُنکے ساتھ
ڈوبنا خورشید کا۔ قوسِ قزح کی یہ بہار

مریم — کیا یہی جنت ہے

تھیوڈورا — بیٹی جس جگہ انسان کا
دل بہل جائے وہی فردوس ہے۔

مریم — اے اماں جان
میں تو رہتی رات دن یاں

(جس بُرج میں عیسیٰ ہے اُسے دیکھ کے) — اور یہ کمرہ تو میں
جانتی ہوں خالی ہوگا

تھیوڈورا — اک معزز میہماں
اس میں ٹھہرے ہیں

مریم — وہ کون؟

تھیوڈورا — اک افسر فوجِ عرب

گھیرے تھے اس قلعہ کو پہلے مگر اب دوست ہیں
صلح نے ہم کو ملا کے کر دیا شیر و شکر۔
اور بے خوف و خطر رہنے لگے وہ اس جگہ۔
ہم بھی خوش ہیں دیکھکر ایسا معزز میہماں
اپنے گھر میں۔

(عیسیٰ یکایک باہر نکل آتا ہے)

عیسیٰ (جوش کے ساتھ) بیبیو۔ شکریہ ان الطاف کا۔
غیر ممکن ہے ۔ مگر یہ آپ کا لطف و کرم۔
نقش ہے دل پر مرے

(مریم کی طرف متوجہ ہو کے) اور آپ اے زہرہ جبیں
شاہزادی اشوق سے رہیے یہاں میں جا کے اب
فوج میں اپنی رہوں گا۔

مریم (شرما کے) میرا یہ مطلب نہیں
تھا کہ میری وجہ سے کچھ آپ کو تکلیف ہو
محض یوں ہی کہہ اٹھی تھی۔ ورنہ حضرت آپ تو
میہمان ہیں۔ اور ہم پر فرض ہے سر آنکھوں سے
آپ کی خدمت کریں۔

عیسیٰ لیکن مرے نزدیک تو
آپ مجھ سے بڑھکے یاں رہنے کے قابل ہیں

مریم یہ کیوں؟

عیسیٰ کیونکہ میں خالی پڑا رہتا ہوں اس کمرے میں اور
جب کبھی گھبراتا ہے دل سیر کرنے کو نکل
آتا ہوں یاں دیکھنے کو یہ سماں۔ لیکن جناب
آپ یاں ہونگی تو اس گورے۔ پیارے۔ دلربا۔
نازنیں۔ نازآفریں چہرے سے رونق پائیگی۔

یہ بہار اور آپ کا حسن و جمال اک شمع کے مثل اپنی روشنی کے بزم قدرت کو بہت جگمگا دے گی۔ تو اے غنچہ دہن اس سین کا لطف بڑھ جائیگا۔ اور اسکی یہ روح افزا بہار ہو گی دہ چند آپ کے ان لالہ گوں رخساروں سے۔ اس لیے بس آپ ہی رہیے یہاں۔ یہ خاکسار جاتا ہے

مریم یہ غیر ممکن ہے۔

عیسی نہیں بس آپ ہی رہیے اس کمرے میں جن کی ذات سے ہے رونق باغ قدرت اور جو۔

تھیوڈورا بیٹی بس اب چل

مریم چلتی ہوں

عیسی جائیے گا خیر۔ لیکن سیر کیجیے دو گھڑی جلدی کیا ہے؟

تھیوڈورا پھر کبھی آئیں گے اب تو وقت ایک کام ہے جسکے لیے جاتے ہیں۔

(تھیوڈورا مریم کو ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیجاتی ہے)

عیسی (تھوڑی دیر سناٹے میں رہ کے) کیوں؟ یہ کون تھی؟ حور کیا اس سے زیادہ خوبرو ہو گی؟ نہیں تو فرشتہ ہو گی یہ؟ یہ بھی نہیں؟ پریوں کا حسن بھی سنا ہے دل ربا ہوتا ہے۔ لیکن اسقدر دلستانی اُن میں ہو۔ ممکن نہیں۔ پھر کون تھی؟ بس فلورنڈا یہی تھی اور اُس کے ساتھ تھی اُس کی ماں۔ بیٹی کہا بھی اُس نے تھا۔ کیا آگئی

اُندلس سے وہ۔ مگر موسیٰ تو کہتے تھے کہ بعد
چند دن کے آئے گی۔ کیا جولین نے جھوٹ موٹ
اُنکو فقرہ دے دیا؟ بیشک یہی ہے۔ ورنہ یاں
کس طرح وہ آ گئی؟ اُسکے سوا اپچرا اور کون
خوبرو ہو سکتا ہے ایسا کہ پہلی ہی نگاہ
لے گئی دل سے مرے صبر و قرار؟ اور کس کے حُسن
کے مقابل روشنی سورج کی مٹ سکتی تھی؟ یا
چاند کا چہرہ اُتر جاتا؟ فلورنڈا ہی تھی
تو گئی کس جا؟ کہاں غائب ہوئی؟ وہ آہ ہیں
(موسیٰ آ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)
دل کو کیونکر ہجر میں بہلاؤں؟
(کچھ آہٹ پا کے)
موسیٰ

موسیٰ (مسکرا کے) کہیے کس
سوچ میں ہیں؟

عیسیٰ آپ تو کہتے تھے وہ اسپین میں
ہے۔ مگر میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا یہاں۔

موسیٰ (قریب آ کے) کس کو صاحب

عیسیٰ شاہزادیِ فلورنڈا کو۔ اور
کس کا میں مشتاق ہوں؟

موسیٰ وہ تو جناب اس قلعہ سے
مدتیں گذریں روانہ ہو چکی۔ جب ہم یہاں
فوج لے کر آئے تھے اور گھیرا تھا سبطہ کو اس
سے بھی پہلے جا چکی تھی وہ

عیسیٰ غلط

موسیٰ خود جو لبین
مجھ سے کہتا تھا

عیسیٰ غلط اُس نے کہا

موسیٰ کیوں کیا سبب؟
جھوٹھ کہتا مجھ سے وہ؟

عیسیٰ میرے سب بے لے امیر
آپ کو فقرہ دیا اُس نے

موسیٰ تو مین پھر پوچھوں گا۔

عیسیٰ اب تو اے سردار مجھ مین ضبط کی طاقت نہیں
جایئے اسوقت مَیں اک دو گھڑی کے واسطے
جا کے تنہائی میں رووں اپنی قسمت پر ذرا

(کمرے میں جا کے دروازہ بند کر لیتا ہے۔ اور موسیٰ بھی چند ساعت کے بعد چلے جاتے ہین)

---

(۴)

نظم غیر مقفّٰی کو ہم آیندہ سے نظم معرّیٰ ہی لکھا کریں گے۔ ہمارے لائق و معزز دوست جناب مولوی محمد عبد الحق صاحب ہیڈ ماسٹر مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد دکن نے اس نظم کے لیے یہ نام تجویز فرمایا ہے جو ہمیں بہت پسند ہے۔ ہمارے نوعمر دوست تجمل شاہ خان صاحب شفق رامپور سے لکھتے ہیں کہ نئے نام کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہی پُرانا نام "نثر مرجز" کافی ہے۔ یہی مضمون مولوی میر علی حیدر طباطبائی پروفیسر نظام کالج کی نظم سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور یہی دیگر اساتذۂ فن بھی فرماتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ ہم اگر اس قسم کے کلام کو نثر تسلیم کرتے تو نثر مرجز ہی کہتے۔ ہم تو اسے نظم سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ بحر اور وزن کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ لہذا ضرور ہے کہ ایک نیا نام بھی تجویز کیا جائے۔ اور وہ نام یہی اچھا معلوم ہوتا ہے جو مولوی عبد الحق صاحب موصوف نے تجویز فرمایا ہے۔

پانچواں سین ۔ آدھی رات

اشخاص

عیسیٰ بن مزاحم ۔ الکاڈیو ہسپانیہ کا ایک معزز سردار ۔ اُس کے چند ہمراہی سپاہی ۔ ہسپانیہ کے دو غلام ۔ مریم ۔ جولین ۔ عیسیٰ کے چند ہمراہی ۔

حالت

ساحل بحر ۔ طوفان بپا ہے ۔ موجیں اُٹھ رہی ہیں ۔ اور رات کے سناٹے میں ہسپانیہ کی ایک کشتی قلعہ سبطہ کے نیچے کنارے سے بندھی ہوئی ہے ۔ ہسپانیہ کے چند سپاہی اور غلام کچھ کشتی میں اور کچھ کنارے خاموش کھڑے ہیں ۔ سامنے قلعے کا کوٹھا اور بُرج ہے ۔ جس پر یکایک عیسیٰ آکے ٹہلنا شروع کرتا ہے ۔

عیسیٰ (خود بخود) اے سمندر! میرے دل کی طرح تجھ میں بھی یہ جوش
کس لیے پیدا ہے؟ یہ دیوانگی کیوں؟ منہ میں کف
پھر پھر آتا ہے ترے؟ کس پر یہ غصہ؟ کیا کسی
عارضِ گلگوں کا دیوانہ ہے تو بھی؟ سچ بتا ۔
ورنہ یوں سر کو پٹکنا ۔ اور روئے وے مارنا
پتھروں پر ۔ غیر ممکن تھا ۔ یہی حال سب
عاشقوں کا ۔ عشق! اے اندوہ و پُر آلام عشق!
ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی؟ کیسا رسے
بہہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں اور آندھیاں
خاک اُڑاتی پھرتی ہیں ۔ اور آہ تو اے آسمان
ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں ۔
اور تارے گویا انگارے ہیں ۔ جن پر لوٹتی
ہے نظر میری مری اُمیدوں کو لے کر عجب
بیقراری اور بیتابی کے ساتھ

(نیچے کشتی اور لوگوں کو دیکھتے ہی چونک کے)

ایں! کون لوگ
ہیں یہ جو اس وقت آئے ہیں یہاں؟ کس کام کو
اس گھڑی آئے گا کوئی؟ خیر کوئی کام بھی
ہو۔ مگر کیوں چپ ہیں یہ سب؟
(کچھ آواز سن کے)
لو سنو کچھ کہتے ہیں۔
(انکے عین سر پہ آکے چھپا کھڑا ہو جاتا ہے)

ہسپانیہ کا سپاہی دیر کیوں اتنی ہوئی؟

دوسرا۔ آتے ہونگے

پہلا خوف ہے
پھنس نہ جائیں قلعہ میں

دوسرا اکتادیو ایسے نہیں
باز اڑا ہے گر تو قمری کو پکڑ ہی لائے گا

پہلا۔ چپ رہو اب سن نہ پائے کوئی۔

عیسیٰ (چونک کے) قمری! قمری کیا؟
کس کو قمری کہتے ہیں یہ؟ ہو نہ ہو کچھ راز ہے۔
اور اندیشہ بھی ہے تو مستعد ہو جاؤں میں
(تلوار کھینچ کے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر پیچھے ایک دروازے سے سر نکال کے۔ اور ایک طرف دیکھ کے)
کون لوگ آتے ہیں یہ؟ میں چھپ رہوں۔
دیکھوں کیا کرتے ہیں؟
(اکتادیو اور مریم باتیں کرتے ہوئے گذر رہے ہیں)

اکتادیو۔ بس وہی قدم اور

مریم ابا جان
کیوں یہاں آئے ہیں آدھی رات کے وقت۔ اور کیوں

اکنا دیو
مجکو بُلوایا ہے ؟
آیا اندلس سے ہے کوئی
شخص۔ شاید اُسکو پہچنوائیں گے
(عیسیٰ اُن کے گذرنے کے بعد دروازے سے سر نکالتا ہے)

عیسیٰ
بیشک کوئی
فتنہ ہونے والا ہے۔

اکنا دیو (کشتی کے پاس پہونچ کے)
کشتی مین چلیے

مریم
میں نہیں
جاؤں گی کشتی میں۔

اکنا دیو
کیوں؟

مریم
کیوں جاؤں کیا رکھا ہے واں؟

اکنا دیو۔ (اپنے لوگوں سے)
اس کو لیجاؤ
(دو غلام زبردستی مریم کو پکڑ کے کشتی میں لے جاتے ہیں)

مریم (چیخ کے)
کوئی میری مدد کو آئے۔ ہائے!
مجکو یہ پکڑے لیے جاتے ہیں
(ایک شخص کشتی کھولنے لگتا ہے)

عیسیٰ (جوش سے)
وہ تو میں کہتا ہی تھا
(جھپٹ کے)
آیا میں گھبرانا نہ تم۔
کون ہو تم ظالمو۔ جو رات کو چوروں کی طرح۔
ایک لڑکی کو چرا کر لے چلے ہو؟
(جو کشتی کھولتا تھا اُسے تلوار سے قتل کرتا ہے)

سپاہی
مرگیا!
(تڑپ کے مرجاتا ہے)

عیسیٰ (کشتی میں کود کے) کون ہے بتلا؟

(ایک اور کو قتل کر کے) نہیں تو تم سبھوں کو اِس گھڑی
قتل کر ڈالوں گا۔ قبل اسکے کہ کوئی بھی تمھیں
جان پائے کون تھے؟ کیوں آئے تھے؟ کس واسطے
ایک لڑکی کو لیے جاتے تھے؟

اکتادیو (بڑھ کے) پائے گا تو اس
کا جواب اس میری شمشیرِ دو پیکر سے

عیسیٰ (حملہ کر کے) تو لے
(اکتادیو کو مار کے پانی میں گرا دیتا ہے)

مریم (جوش کے ساتھ) واہ کیا تلوار تھی! کیا ضرب تھی!

ایک ہسپانیہ کا سپاہی اکتادیو!
آہ تم مارے گئے تو لوں گا میں بدلا

دوسرا سپاہی تو میں
بھی تمھارے ساتھ ہوں
(دونوں جھپٹتے ہیں)

عیسیٰ آؤ کروں دونوں کو قتل
ایک ساتھ ——
(دونوں عیسیٰ کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں)

مریم اے نیک سردارِ عرب میں آپ کی
لونڈی ہوں۔ اس جا نہ ہوتے آپ گر تو یہ شقی
لے گئے تھے مجکو

عیسیٰ (غلاموں سے جو مریم کو پکڑے ہوئے تھے) بولو کون ہو تم لوگ۔ اور
کیوں لیے جاتے تھے اس لڑکی کو؟

غلام (دوڑ کے قدموں پر گر کے) حضرت ہم غلام
بادشاہِ اندلس کے تھے۔ مگر اب آپ کے
بندے ہیں۔

عیسیٰ کیوں آئے تھے یاں؟

غلام اصل میں یوں ہی حضور

بھاگ آئی تھی یہ لڑکی قصرِ رزریق کے
جس پہ برہم ہو کے اُس نے بھیجے تھے یہ چند لوگ
اور افسر اُن پہ تھا اکتانیو - جو اک بڑا
ہوشیار افسر تھا اس کی فوج کا - وہ چپکے سے
ہم کو لایا - اور لے آیا یہاں اک غار سے
تاکہ لے بھاگے اِسے کشتی میں بٹھلا کے - مگر
آپ آ پہونچے یہاں - یہ بچ گئی - اکتانیو
آپ کی تلوار سے مارا گیا - اور اُسکے ساتھ
جو سپاہی تھے ہوئے سب قتل - ہم ہیں اب غلام
آپ کے

مریم (غصہ سے) سب جھوٹ ہے یہ - اے بہادر نامدار
رزریق بے رحم ہے - ظالم ہے - بدکردار ہے -
آبرو لیتا ہے سب کی - مجھ کو بھی وہ چاہتا
تھا کہ بے عزت کرے - لیکن میں اک تدبیر سے
بھاگ آئی یاں تو اُس نے

عیسیٰ (چونک کے اور پہچان کے) شاہزادی آپ ہیں؟

مریم ہاں وہی بدبخت شہزادی ہوں میں جو آپ سے
قلعہ کے اوپر ملی تھی -

عیسیٰ آپ کیونکر آئیں یاں؟

مریم اُس نے یہ فقرہ دیا مجھ کو کہ نیچے ابا جان
آئے ہیں مجھ کو بلاتے ہیں -

عیسیٰ تو میں خوب آ گیا!
ہاں غضب ہی ہو گیا تھا - خیر چلیے قلعہ

مریم — چلیے۔ اب لونڈی ہوں میں تو آپ کی

عیسیٰ — یہ فرض تھا۔

شاہزادی میرا اس قدم۔

(غلاموں کو رسی میں باندھ کے) آئیے اوپر چلیں۔

(ہاتھ پکڑ کے اُسے اور دونوں غلاموں کو اوپر لے جاتا ہے)

(۵)

یہ ڈراما درمیان کے چند نمبروں میں شایع نہیں ہوا تو ہمارے احباب شکایت کے خطوط بھیجنے لگے۔ لہذا اس نمبر میں ہم پھر اپنی اس نظم کو جو اُردو کی دنیا میں انوکھی ہے شروع کرتے ہیں۔

چھٹا سین۔ آخر شب

اشخاص

عیسیٰ بن مزاحم۔ مریم۔ ہسپانیہ کے اسیر شدہ غلام۔ جوکین عیسیٰ کے چند ہمراہی سپاہی۔

حالت

عیسیٰ بن مزاحم اور شاہزادی مریم قلعے پر اُس بُرج کے سامنے نمودار ہوتے ہیں جس میں عیسیٰ رہتا ہے۔

عیسیٰ — گر اجازت ہو تو میں لے جاؤں ان حبشیوں
کو ذرا پہونچا دوں اپنے نوکروں میں

مریم — جائیے۔
میں بھی رخصت ہوتی ہوں اب

عیسیٰ — ایسی کیا جلدی ہے اے
نازنین

مریم — پھر آؤں گی

عیسیٰ — لیکن مجھے کچھ آپ سے

کہتا ہے

مریم تو جائیے ٹھہری ہوں میں
(عیسی غلاموں کو بھگاتا ہے)

(خود بخود) اے بے نیاز

کیا بچی ہوں اس گھڑی - ورنہ گئی گذری ہوئی تھی - خبر بھی کوئی سن پاتا نہ - اے بیٹے خدا کے ترا احسان ہے جو بچ گئی میں
(عیسی آتا ہے)

آئیے!

آپ نے مجھ کو بچایا ہے رہوں گی عمر بھر آپ کی لونڈی - نہ آتے آپ اگر اک لمحہ اور تو مجھے یہ لے گئے تھے - اور ظالم ردا ورق آبرو لیتا مری - لیکن میں اس کے ساتھ ہی زہر کھا لیتی - نہیں تو مار کے اپنے چھری مر گئی ہوتی - غرض جس طرح بنتا جان دے دیتی میں اپنی - بچائی جان میری آپ نے اب اجازت دیجیے جانے کی مجھ کو

عیسی بیٹھیے

دو گھڑی یاں - ایسی کیا جلدی ہے؟

مریم گر کوئی وہاں

جاگ اٹھا تو غضب ہو جائیگا -

عیسی اے نازنیں

ماہ سیما شاہزادی - اب نہیں ہے ضبط کی تاب مجھ میں - یہ دل دیوانہ بیخود ہو چلا جس گھڑی سے یہ رخ زیبا نظر آیا ہے آہ!

بس تڑپتے ہی گزرتی ہے۔

مریم (حیرت سے) : کہیے اور کچھ۔

میں ادب کرتی ہوں حضرت آپ کا اور اصل میں

یہ نہ تھی امید مجھ کو آپ سے!

عیسیٰ کیوں!

مریم کچھ نہیں۔

اس کو جانے دیجیے۔ لیکن کسی کو کیا امید

آپ سے ہو سکتی ہے۔ جب آپ کا یہ حال ہے؟

عیسیٰ میں نہیں سمجھا

مریم یہی بہتر ہے۔ مجھکو آپ اب

دیں اجازت جانے کی

عیسیٰ کیونکر کہوں ؟

(عیسیٰ بے اختیار لپٹ کے اُس کا بوسہ لے لیتا ہے)

مریم (جھنجھلا کے) بس چھوڑیے

جاتی ہوں۔ پھر آؤں گی

(ناگہاں جولین ننگی تلوار کھینچ کے جھپٹتا ہے)

جولین او بیحیا ظالم عرب!

چھوڑ اسے! اور آ ادھر!

(عیسیٰ سنبھل کے اُس کی تلوار اپنی تلوار پر لیتا ہے)

عیسیٰ (چونک کے) آیں جولین!

مریم (ہاتھ جوڑ کے) اے ابا جان!

بے خطا ہیں یہ۔ سمجھ کر کھینچیے تلوار کو۔

پہلے سُن لیں حال۔ پھر جو چاہیں کریں مختار ہیں

جولین چپ رہ او بدکار قطامہ!

عیسیٰ ہوا ہے کیوں سڑی؟

ہوش کی اپنے خبر لے۔

جولین یعنی تو کچھ عذر بھی
رکھتا ہے؟ ایسے بہت فقرے سُنے ہیں۔

مریم آہ! آپ
سُن تو لیں جو کچھ کہیں یہ۔

جولین چھوڑ میرے قلعہ کو
بس نکل جا یاں سے اے بدکار لڑکی جس قدر
جلد خالی ہو یہ قلعہ تجھ سے بہتر ہے۔ نہیں
ہے جگہ تیرے لیے یاں
(لات مار کے مریم کو زمین پر گرا دیتا ہے)
(عیسیٰ سے) خیر کہہ کیا کہتا ہے؟

عیسیٰ سو رہا تھا تو تو اپنے قلعے میں آرام سے
اور یاں جاسوس آئے راورق کے تا کہ اس
شاہزادی کو چُرا لیجائیں دے کر اس کو دم
لے گئے نیچے وہاں ٹھہلا کے کشتی میں بہ جبر
لیچلے تھے وہ کہ جا پہونچا میں اُنکے سر پہ۔ اور
قتل کر کے اُن کو۔ لے آیا یہاں اس نازنیں
شاہزادی کو

جولین غلط! نکلی یہ کیونکر قلعے سے؟

عیسیٰ یہ بھی شامت اور غفلت تیری تھی۔

جولین کیوں؟

عیسیٰ یوں کہ وہ
نام سے تیرے بُلا کر لیگئے اسکو

جولین (سوچ کے) دکھا
اُن کی لاشیں تو یقین آئے مجھے

عیسیٰ چل ساتھ اور
دیکھ اُن لوگوں کو جو کالک لگانے آئے تھے
تیرے منہ میں

جولین (مستعد ہو کے) چل

عیسیٰ ابھی

(دونوں جاتے ہیں)

مریم زمین پر پڑے پڑے) میرے خدا! اے کارساز!
پڑ گئی کیسی یہ مجھ پر! کیا کروں! بے عزتی
اور رسوائی گوارا کس طرح ہو! ہائے ہائے!
میں تو دنیا سے گئی گذری ہوئی

(اُٹھتی ہے)
اور وہ بھی تو
بے گنہ پکڑا گیا ہے!

(کچھ سوچ کے) اب مجھے کیا چاہیے؟
جب تک آئیں یہ پلٹ کر حکم دیدوں نوکروں
کو میں عیسیٰ کے کہ اُنکے آتے ہی وہ قیدیوں
کو یہاں حاضر کریں۔ اور اس طرح اوراک ثبوت
بیگناہی کا ہماری پیش ہو
(چلی جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آ کے اُسی جگہ بیٹھ جاتی ہے)

مریم میں آ کے یہاں
کیسی ذلت اور رسوائی ——
(عیسیٰ اور جولین کے آنے کی آہٹ سُن کے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور
وہ دونوں آتے ہیں)

عیسیٰ تو اب تو آپ کو
شک نہیں ہے کچھ؟

جولین
مگر میں پوچھتا ہوں تم سے یہ
گو کیا احسان تم نے مجھ پہ۔ لیکن کیا سبب
ہاتھ اس لڑکی کا پکڑے کھینچتے تھے؟

مریم (اٹھ کے)
آبا جان!

جولین
چپ ہو او بدکار!

عیسی
پھر بدکار کہتا ہے اسے؟

مریم
میں نہیں بدکار ہوں۔ میں نے بچائی آبرو
راورق کے ہاتھ سے۔ پہلے وہاں سے بھاگ کے
اور اب اس نیک سردارِ عرب کی کوششیں
کام آئیں

(عیسی کے نوکر اسیر شدہ حبشیوں کو لے کے آتے ہیں اور جولین اور عیسی کے سامنے ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں)

عیسی
خوب آئے تم یہاں اسوقت
(جولین سے)
لے
دیکھیے یہ ہیں وہ قیدی

جولین (قیدیوں سے)
سچ بتاؤ کون ہو
تم؟ یہاں کس واسطے آئے تھے؟ کیا کر کے چلے
تھے؟

ایک قیدی
حضور۔ اسکی حقیقت یہ ہے۔ ہم راورق
کے غلام۔ اور اُس نے جب یہ شاہزادی بھاگ کے
یاں چلی آئیں تو نادم ہو کے حکم الٹا دیو
کو دیا لے کر ہمیں آئیں یہاں سبطہ میں اور
ان کو لے بھاگیں یہاں سے ـــــ

جولین (غصے سے)
چور بھی ہو وہ شقی!
خیر۔ پھر؟

قیدی — وہ الغرض لائے ہیں یاں۔ اور آج
رات کو چپکے سے لائے کشتیاں قلعے کے پاس
ہم کو چھوڑا ان میں۔ پھر خود آئے اوپر۔ کمرے میں
شاہزادی کے۔ کہا اُن سے کہ نیچے آپ نے
ہے بلایا اُن کو

جولین — کس نے؟

قیدی — آپ نے۔ وہ آپ ہی
کے تو دھوکے میں چلی آئیں۔

جولین — عجب! پھر کیا ہوا؟

قیدی — ان کو لے کر آئے وہ۔ نیچے بٹھایا کشتی میں۔
اور چلنے ہی کو تھے یاں سے۔ کہ ناگہ ایک چیخ
ماری شہزادی نے اور آ پہونچے
(عیسیٰ کی طرف اشارہ کر کے) آپ۔ اور آتے ہی
کھینچ لی تلوار۔ مارا ایک کو۔ اکتا دیو
سامنے آئے تو وہ بھی کام آئے۔ بعد ازاں
دو رفیقوں کو بھی اُن کے جب کیا قتل آپ نے
تب تھے ہم مجبور۔ فوراً سر جھکایا آپ کے
سامنے۔ اور آپ کے ہیں اب غلام

جولین (تلوار پھینک کے) — اے نامور
افسر فوج عرب! میں بدگماں تھا تجھ سے آہ
جبکہ تو نے تھی بچائی آبرو میری

(عیسیٰ کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ جوڑتا ہے)

خدا!
کے لیے کر دے خطا میری معاف اب۔ سخت یہ
تھی حماقت میری جو بے سوچے سمجھے کھینچ کے

تیغ کو جھپٹا تھا تجھ پر۔ اُس پہ جو محسن تھا اور
آبرو رکھ لی تھی میری راورق کے سامنے
آہ! کیسا ظلم یہ مجھ سے ہوا؟ اب کس طرح
چار آنکھیں کر سکوں گا تجھ سے۔ پھر جب سامنا
ہو گا موسیٰ کا تو کیونکر بات کی جائیگی اُس
سے؟

عیسیٰ
نہ کہہ کچھ جولیں اس بارے میں لیکن ہرا
عذر تو سُن لے کہ کیوں ہاتھ اس پیاری نازنین
کا پکڑ کے کھینچا تھا میں

جولین
نہیں۔ اب پھر کبھی
اسکو سُن لوں گا۔

عیسیٰ
مگر میں تو سُناوں گا ابھی
بار ہٹ سکتا نہیں دل سے مرے جبتک بیان
کر نہ دوں گا صاف صاف اس کو کہ کیوں ایسی خطا
ہو گئی مجھ سے

جولین
نہ کر للہ اب زیادہ ذلیل
بس نہیں ہے تاب اب سننے کی مجھ میں اگھڑی
کل کہے گا سامنے موسیٰ کے۔ تو اُس وقت میں
غور سے سُن کر بتاؤں گا۔ خطا کر اب معاف
اور جانے دے مجھے

عیسیٰ (اپنے نوکروں سے)
اب تم تو جاؤ۔ اور ان
کو بھی لیجاؤ وہیں جس جا تھے یہ
(نوکر غلاموں کو لیجاتے ہیں)

جولین
تو میں بھی اب
جاتا ہوں۔

دو باتیں سُن لیں میری تو سُن جائیں جناب
آہ! اس شیریں ادا لڑکی کی صورت نے مجھے
کر دیا دیوانہ - نام اُس کا سنا ہے جس گھڑی
(جولین چونکتا اور عیسیٰ کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے)
سے بہت بیتاب ہوں - بے لطف جینا ہی نہیں
دل کو بے اسکے قرار - اسکی نگہ کے تیروں نے
ڈالے ہیں ناسور دل میں - ہر ادا اسکی بسی
ہے مرے سینے میں - اور اسکی یہ صورت ہر گھڑی
پھرتی ہے آنکھوں کے آگے - ہوتی ہے یہ بستر
ناز پر اپنے - مگر یہ دل پرستش کرتا ہے
اس کی - ہوتی ہے یہ غافل اپنے خوابِ ناز میں
اور میں محرابِ ابرو کے مقابل بیٹھ کے
کرتا ہوں ہر رات کو شب زندہ داری

جولین کل سنوں
گا میں ان باتوں کو اب

عیسیٰ (حیرت سے) کل! کل تک آہ!
صبر کس سے ہو سکے گا! شاہزادی اس گھڑی
اپنے گھر جانے لگیں تو ہو گیا بے صبر میں
اور پکڑا ہاتھ ان کا تاکہ بیٹھیں تھوڑی دیر
اور - لیکن یہ خطا تھی اس دل بیتاب کی
میں نہیں تھا اپنے بس میں

(اُکتا کے) خراب جاتا ہوں میں

جولین پھر ملوں گا -
(جولین مریم کو لے کے جاتا ہے -

عیسیٰ (خود بخود) ہائے اب میں دردِ دل کس سے کہوں؟

چل دیے دونوں نہیں ملتی کسی سے داد اس
خوں چکاں دل کی خداوندا! ترے آگے ہی اب
اس دل پُر حسرت و مایوس کی فریاد ہے۔
(غش کھاتا ہے اور پردہ گرتا ہے)

نظمِ معرّٰے

سنسکرت - یونانی - لاطینی - انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ایک قسم کی نظم ہوتی ہے جس میں قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ جسے انگریزی زبان میں "بلینک ورس" کہتے ہیں۔ یہ نظم ڈراما کے لیے نہایت ہی مناسب بلکہ لابدی ہوتی ہے۔ کیونکہ مکالمہ سے صحیح لطف سوا اُسکے اور کسی قسم کی نظم میں نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس نظم میں ایک مصرع کے الفاظ ٹوٹ کے کئی زبانوں پہ جا سکتے ہیں۔ گفتگو سادی اور بے تکلف رہتی ہے اور پھر اُسکے ساتھ موزونیت کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے۔

اگرچہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ قافیوں کی قید سے آزاد ہونے کے باعث ایسی نظمیں لکھنا زیادہ آسان ہوگا مگر دراصل یہ سب قسم کی نظموں سے زیادہ دشوار ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اور سب نظموں میں الفاظ کا اپنی اصلی اور صحیح ترتیب سے ہٹنا کسی نہ کسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے مگر اس میں چونکہ مکالمہ اور بے تکلف گفتگو سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور نثر عاری کی حقیقی شان قائم رکھنا پڑتی ہے اس لیے اس میں ترتیب الفاظ میں ایک ادنیٰ تغیر بھی معیوب ہے۔ یا یوں کہیے کہ تعقید لفظی سب نظموں میں تھوڑی بہت جائز ہے مگر اس میں مطلقاً جائز نہیں۔ اور اس وجہ سے تصور کرنا کہ اس قسم کی نظم کہنا آسان ہے بڑی فاش غلطی اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ بلینک ورس (نظم معرّیٰ) ہر طرح کی نظموں سے زیادہ دشوار ہے۔ سب کے پہلے اس نظم کا سلسلہ ہم نے دلگداز میں چھیڑا تھا۔ اور

سنہ ۱۹۰۶ء کے پرچون میں ایک ڈراما بھی شایع کرنا شروع کر دیا تھا جسکو تعلیمیافتہ گروہ نے ، یا اُن لوگوں نے جنھیں موجودہ مذاق سخن سے اُنس ہے بہت پسند کیا - مگر پُرانے مذاق کے شعرا میں جو اگلے رنگِ انشا کے دلدادہ ہیں اختلاف پڑا - بعض نے پسند کیا اور بعض نے ناپسند -

ایسے امور میں رائے قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں - انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جس چیز اور جس مذاق سے مانوس اور آشنا ہو جاتی ہے اُسکے خلاف کسی چیز اور کسی مذاق کو چاہے وہ کیسا ہی اچھا ہو نہیں پسند کرتی - ایک لباس ہی کو لیجیے - اپنے وطن کا لباس جس سے نظر مانوس ہو جاتی ہے اُس کے تمام عیوب نگاہ سے مخفی رہتے ہیں - ہر حیثیت اور ہر پہلو سے وہ بھلا اور اچھا معلوم ہوتا ہے - اور انسان جب دوسرے ممالک اور بلاد میں جاتا ہے تو وہاں کی ہر ہر چیز اور ہر ہر وضع پر ہنستا، معترض ہوتا اور وہاں کے لوگوں کا مذاق اُڑاتا ہے - جس کی بنیاد کوئی معقول بات نہیں ہوتی بلکہ صرف اُسکی نامانوسیت ہوا کرتی ہے - اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں یہ اختلاف مذاق و وضع ایک گھڑی کے لیے بھی قائم نہ رہتا - بلکہ ہر شخص دوسرے کی اچھی وضع کو جو عقل کے فیصلہ کی بنا پر اچھی ثابت ہوتی فوراً اختیار کر لیتا - اور ساری دنیا میں عجیب قسم کی یکرنگی و ہم وضعی ہوتی -

الغرض اسی غیر مانوسیت کے باعث بہت سے یکرنگ اور قدامت پرست لوگوں نے اس نظم کو بھی جو باہر کی آئی ہوئی تھی ناپسند کیا - اور اس پر اپنے ذہن سے تراش تراش کے طرح طرح کے اعتراض شروع کر دیے -

ہمارے یہاں لوگ حقیقت اور معنوی امور کو چھوڑ کے لفظی بحثوں کے زیادہ عادی ہو رہے ہیں - شاعری ہی کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مدت دراز سے لوگ زیادہ تر اسی قسم کے مباحث اور جھگڑوں میں پڑتے ہیں کہ یہ لفظ مذکر ہے یا مونث - یہ قافیہ جائز ہے یا نہیں - کون سا زحاف جائز ہے اور کون نہیں - اسکے مقابل مضامین اور معنوی خوبیوں کی طرف شعرا کا اس قدر خیال نہیں جاتا جتنا کہ لفظی محاسن کی طرف جاتا ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ معنوی خوبیوں کا لحاظ چھوڑ دیا گیا ہے مگر ہاں یہ ضرور کہونگا کہ الفاظ کی ظاہری صورت سے زیادہ لحاظ اُنکے معنوی پہلو کا ہونا چاہیے تھا اور یہ نہیں ہوتا - یا ہوتا ہے تو بہت کم -

انھیں لفظی نزاعوں کے رجحان کا نتیجہ تھا کہ جب میں نے اس نظم سے بحث شروع کی تھی اُس وقت بھی یہ بحث چھڑی تھی کہ اس قسم کی نظم کو نظم کہہ سکتے ہیں یا نہیں - اور اب بھی اس موقع پر زیادہ تر بحث یہی ہو رہی ہے - رسالہ فصیح الملک میں اس نظم کے متعلق بہت کچھ بحث ہوئی ہے اور بعض حضرات نے بڑی قابلیت سے مضامین لکھے ہیں - مگر اکثر مضامین میں یہی بحث چھیڑی گئی ہے - اور مخالفین بہت زور دے رہے ہیں کہ "بلینک ورس کو نظم سے تعبیر کرنا غلطی ہے" -

اس میں شک نہیں کہ فارسی و عربی کتب عروض میں اسی قسم کے کلام کو "نثر مرجز" بتایا گیا ہے - مگر جن لوگوں نے فن عروض پر زیادہ وسعت اور غور کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور یونانی و انگریزی محققین کے فیصلوں کو بھی دیکھا ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ شاعری ایک خاص قسم کی تخئیل کا نام ہے جسے قافیہ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی خیال آفرینی اور خاص وضع کے طرز ادا کو شاعری کہتے ہیں نہ محض قافیہ پیمائی کو" -

مگر "بلینک ورس" کو زبان اُردو میں رواج دینے وقت اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نظم ہے یا نثر - بلکہ اصلی بحث یہ ہونی چاہیے کہ یہ طرز کلام عام اس سے کہ نظم ہو یا نثر - موزون ہو یا غیر موزون - اُردو لٹریچر میں اُس کے اضافہ کی ضرورت ہے یا نہیں - یا اس سے بھی تنزل کر کے کہا جائے کہ اس قسم کے کلام سے اُردو نظم و نثر اور ہمارے لٹریچر کو کوئی ضرر تو نہ پہونچے گا؟ اور ایسی نظمیں ہماری زبان میں قابل برداشت ہیں یا نہیں؟

کسی لٹریچر میں جب کوئی نئی چیز پیش کی جائے تو پہلا تصفیہ اسی امر کا ہونا چاہیے کہ آیا ہم اس طرز کلام کو جس سے اسوقت تک ناآشنا رہے ہیں گوارا کر سکتے ہیں یا نہیں - کیونکہ ابتداءً اس نئی صنف سخن کی خوبیوں کے

بجائے صرف اُسکے جائز ہونے سے بحث کرنی چاہیے - رہین اُسکی خوبیاں، وہ اُسوقت کھلین گی جب ہمارے مذاق اُس سے آشنا ہون گے -

"بلینک ورس" کے جائز اور گوارا ہونے کے لیے پہلے ہمیں اس پر نظر ڈالنی چاہیے کہ اُردو لٹریچر کو اس صنف کلام کی ضرورت ہے یا نہین - اگرچہ مین جانتا ہون کہ ہمارے قدیم مذاق کے شعرا ابھی اسکی ضرورت کو نہ محسوس کر سکیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ روز بروز زیادہ محسوس ہوتی جائے گی - اور ملک میں انگریزی تعلیم کو جس قدر زیادہ رواج ہوگا اُسی قدر لوگون کو بلینک ورس کی ضرورت بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ نظر آتی جائے گی -

اب اُردو میں ڈراما ضرور تصنیف ہونگے - کیونکہ جو لوگ انگریزی میں ڈراما کا لطف اُٹھا چکے ہیں وہ تا وقتیکہ خود اپنی زبان مین ڈراما کا لطف نہ پیدا کرلین ہرگز چین نہ لین گے - ایک طرف تو وہ یہ چاہتے ہین کہ شیکسپیر اور کالی داس کے ناٹکوں کا اُردو مین ترجمہ کیا جائے اور اس طرح کہ جو لطف اُنھیں اصلی زبان میں آتا ہے وہی اُردو ترجمون مین بھی آئے - دوسری طرف وہ چاہتے ہین کہ اُسی عنوان پر ہمارے جذبات و واقعات کی تصویرین اُردو ڈرامامین دکھائی جائین - یعنی خود اُردو میں نئے اور اوریجنل ڈراما تصنیف ہون -

اس ضرورت کے تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگون کا یہ شوق بغیر نظم معرّی (بلینک ورس) کے رواج دیے اُردو کے موجودہ اصناف سخن سے بھی پورا ہو سکتا ہے یا نہین؟ جو حضرات ڈراما کی حقیقت و حالت سے واقف نہین وہ تو بے تکلف کہدین گے کہ کوئی خیال اور کوئی واقعہ نہین جسے ہم اپنی موجودہ شاعری کے ذریعہ سے نہ ادا کر سکتے ہون - مگر جو لوگ جانتے ہیں کہ ڈراما کیا چیز ہے وہ اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائین گے کہ نظم معرے کے اختیار کیے بغیر اُردو میں ڈراما لکھے ہی نہین جا سکتے -

جو ناظرین انگریزی مذاق سخن سے ناواقف ہین اُن پر ڈراما اور

بلینک ورس کی نوعیت کے ظاہر کرنے کے لیے میں اپنے ایک پرانے ڈراما کا کسی قدر حصہ چند مقامات سے منتخب کر کے پیش کرتا ہوں۔

مثلاً حاکم سبطہ کی بیٹی فلورنڈا جو راورق بدکار بادشاہ اسپین کے محل میں ہے اور اُسکی بدکاریوں سے ہراساں ہے۔ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی کہہ رہی ہے۔

فلورنڈا

کس غضب میں پڑ گئی ہوں! آہ! کچھ بنتا نہیں!
کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ کیونکر بچوں؟ اور کون ہے
جسکے آگے سر کو دے ماروں؟ یہاں کوئی نہیں
جو خبر لے اس مصیبت میں مری۔ افسوس! میں
پھنس گئی کیسی بلا میں؟ میں تو آتی ہی نہ تھی
آہ! والد نے نہ مانا! دیکھیے قسمت میں اب
کیا لکھا ہے؟ اور کیسی ذلتیں ہوتی ہیں؟ اے
راورق ظالم! تجھے کچھ شرم بھی آتی نہیں!
مر نہیں جاتا ہے کیوں؟ جو تیرے ظلموں سے بچیں
لڑکیاں شاہی گھرانے اور معزز لوگوں

(کچھ آہٹ پا کے) کون ہے؟

یا ایک جگہ اس وضع سے سین دکھایا گیا ہے کہ علیسی (ہیرو) قلعہ کے اوپر دریا کے کنارے ٹہل رہا ہے اور غروب آفتاب کا تماشہ دیکھ کے کہتا ہے۔

علیسی (خود بخود) آہ! دنیا تجھ میں کیا کیا لطف ہیں کس شان سے
دیکھو سورج ڈوبتا ہے اور کرنیں کس طرح
پانی پر افشاں چھڑکتی ہیں! اُدھر اس کو ہسار
کو طلائی کپڑے سورج نے پہنائے ہیں جہاں
گھاس کی وہ ننھی ننھی پتیاں اس دھوپ میں
جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں۔ وہاں اُس بیل نے
کیا طلائی جھالریں مقیش کی لٹکائی ہیں!

پھول بھی ہر رنگ کے اُس جا کھلے ہیں - اور وہ
دیکھو کلیاں مُسکراتی ہیں عجب انداز سے!
دیکھ کر یہ لطف چڑیاں کیسی خوش ہیں! اور کس
جوش سے سب چہچہا اُٹھتی ہیں! کیسی شاد ہیں!
جسکو دیکھو خوش ہے۔ لیکن - آہ! اک میں ہوں کہ دل
کو قرار آتا نہیں - الجھن ہے - بیتابی ہے - اور
ہر گھڑی اک درد ہے - پیاری فلورنڈا تجھے
اک نظر دیکھوں تو چین آئے - کہاں ایسے نصیب
میں تڑپتا ہوں یہاں - تو اندلس کے باغوں میں
سیر کرتی - ناز سے اٹھلاتی - ہنستی بولتی -
کھلکھلاتی - توڑتی پھولوں کو - پھر انکو عجب
ناز سے سر پر لگاتی ہوگی

(کچھ آہٹ پا کے اور ایک آواز سُن کے)

کیا! یہ کون تھا؟

یہ تو اظہار خیالات و جذبات کے موقعے تھے - اب ذرا گفتگو کی شان بھی ملاحظہ ہو -

مریم (راورق کے دست ستم سے اُسکی ساقیہ کی مدد سے بچ کے فلورنڈا کے پاس آئی ہے - وہ ساقیہ بھی موجود ہے اور مریم محل سے بھاگنے کا قصد کرتی ہے - اُس وقت تینوں عورتوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے -

مریم (افق مشرق کو دیکھکے) صبح اب ہونے کو ہے
دیکھیے جھونکے نسیم صبح کے - وہ آپ کی
زلف برہم کر رہے ہیں - اور تارے کے چراغ
جھلملاتے ہیں فلک پر - اور سیہ چادر شب
کی مسکتی جاتی ہے - ایسا نہ ہو چڑیاں اُٹھیں
اور جگا دیں راورق کو - بس تو جاتی ہوں بہن

فلورنڈا - کیا کروگی جا کے اب؟

ساقیہ: ان کو نہ روکیں

فلورنڈا: کِس لئے

ساقیہ: بادشہ کو گر ذرا بھی شک ہوا تو بس سمجھے
اور ان کو قتل کر ڈالیں گے۔
تو جاؤ بہن۔
اب کہاں جاؤ گی تم

مریم: جس جا خدا لیجائے

فلورنڈا: تم
کس طرح جاؤ گی یاں سے؟

مریم: خاک اُڑاتی۔ ٹھوکریں
کھاتی۔ ننگے پاؤں جاؤنگی بہن۔ اور جس طرح
بن پڑے گا۔ آپ کو پہونچاؤں گی زیبون میں

ساقیہ: کیوں نہیں جاتی ہو سبطہ میں؟ جہاں آرام سے
قصر میں اپنے پھوپھا کے زندگی بھر رہ سکو۔

مریم: خیر جاؤں گی وہیں۔

فلورنڈا: لیکن وہاں تو ان دنوں
ہو گی یورش کافروں کی ہر طرف۔ اور کوئی شخص
جا نہ سکتا ہوگا اندر شہر کے

مریم: میں جاؤنگی جیسے بنے۔

فلورنڈا: تو مرا سب حال کہدینا۔

مریم: ضرور

فلورنڈا: اور یہ کہ اب
مجکو جلدی واں بلالیں

مریم: لو خدا حافظ بہن!
(چلی جاتی ہے)

ہمارے اس ڈراما کے چھ سین سنہ ۱۹۰۰ع کے آخر اور سنہ ۱۹۰۱ع کی ابتدا میں دلگداز کے صفحون پر شایع ہوے تھے - پھر اسکے بعد نوبت نہ آئی - اور یہ ڈراما ناتمام پڑا رہ گیا -

اس موقع پر اسکے ان چند ٹکڑون کو سخن سنجان ملک کے سامنے پیش کر کے مین دریافت کرتا ہون کہ مقفی نظمون مین یہ خیالات اسی عنوان اور اسی نثر نما ترتیب سے ادا کیے جا سکتے ہین؟ اور باہمی گفتگو مین اسی طرح کی سادگی کے ساتھ بھرتی کے الفاظ سے بچنا ممکن ہے یا نہین؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ ناممکن ہے - اور پھر اسکے ساتھ اس کا بھی خیال کیا جائے کہ اب اُردو کو ڈرامون کی ضرورت ہے - ایسی حالت مین سوا اسکے کہ اس قسم کے کلام کو عام اس سے کہ آپ اسے نظم معرّیٰ کہین یا نثر مرجز اُردو مین رواج دیا جائے اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

شعرائے اُردو سے یہ نہین کہا جاتا کہ آپ غزل گوئی اور قصیدہ خوانی کو موقوف کر دین - یہ بھی نہین درخواست کی جاتی کہ مثنویان نہ لکھی جائین - نہ یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ آیندہ قطعات و رباعیات یا مخمس و مسدس نہ کہین - وہ اس پر بھی مجبور نہین کیے جاتے کہ خواہ مخواہ اس قسم کی نظم معرّیٰ وہ بھی کہا کرین - پھر مین نہین سمجھ سکتا کہ نزاع کس بات کی ہے؟ انتہائے مافی الباب یہ ہے کہ اگر کوئی انگریزی مذاق اور جدید رنگ کا دلدادہ اس قسم کی نظمین شایع کرے تو جن حضرات کو وہ ناپسند ہون وہ اُنھین نہ ملاحظہ کرین - چھٹی ہوئی -

بلینک ورس مین جب عروض کی بحرون کی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے تو اُسے غیر موزون ہرگز نہین کہا جا سکتا - زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے اسی قدر ہے کہ نظم کے جن اصناف سے ہم آشنا ہین یا جن کو اگلے دنون ہم نظم کہا کرتے تھے اُنکے حلقے سے یہ انوکھی نظم خارج ہے - ورنہ صرف قافیے کے نہ ہونے سے اس وضع کے اشعار کو غیر موزون کہنے کی کوئی وجہ نہین ہے -

زمانے کی پیشین گوئی ہے کہ اس قسم کی شاعری کو اُردو مین رواج ہوگا -

اور آئندہ بڑے بڑے نازک خیال شعرا اس رنگ میں طبع آزمائی کریں گے۔ آپ چاہے منظور کریں یا نہ کریں یہ ہونے والی چیز ہے۔ اور

گر نہ ستانی بہ ستم می رسد

نظم معرّےٰ

جون سنہ ۱۰ء کے دلگداز میں ہم نے نظم معرّیٰ پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اپنے ایک موزون ڈراما کے چند حصے بہ طریق نمونہ دلگداز کی سابقہ جلدوں سے نقل کرکے پیش کیے تھے۔ اور اُردو شعر و سخن کا ذوق رکھنے والوں کو آمادہ کیا تھا کہ اس طرف توجہ کریں۔ کیونکہ یہ نظم گو اسے بعض لوگ ناپسند کرتے ہوں یا بعض اسے نظم ہی نہ سمجھتے ہوں مگر ایسی نہیں ہے کہ بے پروائی سے چھوڑ دی جائے۔ کیونکہ بغیر اسکے اختیار کیے اُردو زبان میں ڈراما کے فن کو ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

اسکے بعد ہماری نظر سے مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کا رسالہ نیرنگ رامپور گذرا جس میں جناب شاد ان لکھنوی نے اس نظم پر بڑی قابلیت اور تحقیق سے بحث کی ہے۔ اور ثابت کر دیا ہے کہ اسے نثر مرجز کہنا غلطی ہے بلکہ دراصل یہ نظم ہی ہے۔ اور اُردو دان پبلک کو اُن کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی غلطی دور کر دی۔ اور ان کی تحقیق کی بنا پر ہم اب اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نثر مرجز نہیں بلکہ نظم معرّیٰ ہی ہے جس نام سے کہ دلگداز میں یہ نظم دس سال پیشتر سے یاد کی جا رہی تھی۔

جون کے دلگداز کو ملاحظہ فرما کے متعدد قدردانان دلگداز نے اس کو بہت پسند فرمایا۔ اور تاکید شروع کی کہ ہم اُس ڈراما کو پورا کریں۔ اور دلگداز میں نظم معرّیٰ کا سلسلہ برابر جاری رکھا جائے۔ اُن کی خواہش کے مطابق ہم اپنے اُس فتح اندلس کے ڈراما کو بھی پورا کر دیں گے۔ لیکن سردست ایک نیا مختصر تاریخی ڈراما جو صرف دو سینوں میں ختم ہو گیا ہے موزون کرکے نذرِ

ناظرین کرتے ہیں۔

یہ ڈراما رومۃ الکبریٰ کی تاریخ قدیم سے ماخوذ ہے۔ روم میں دو گروہ تھے ایک بطریق لوگ (پیٹریشین) یعنی امرا و معززین۔ اور دوسرے عوام الناس (پلی بین) ان دونوں گروہوں میں اپنے اپنے حقوق کے لیے اکثر نزاع رہا کرتی تھی۔ چنانچہ انھیں جھگڑوں کے دور کرنے کے لیے سنہ ۴۴۹ ق م میں وہاں یہ نیا طریقۂ حکمرانی جاری کیا گیا تھا کہ دس مجسٹریٹ منتخب کیے گئے اور حکومت کے پورے اقتدارات اُن کے ہاتھ میں دیدیے گئے۔ یہ مجسٹریٹ وہاں "ڈسم ویر" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ دو ہی برس یہ انتظام رہنے پایا تھا کہ آپیوس قلادیوس نام ایک شریر النفس ڈسم ویر کی بد معاشی سے ایک ایسا خطرناک واقعہ پیش آیا جس سے ہنگامہ ہو گیا۔ اور سلطنت کو سنہ ۴۴۷ ق م میں ڈسم ویروں کے تقرر کو منسوخ کر کے پھر اپنا پرانا انتظام جاری کر دینا پڑا۔ وہ واقعہ کیا تھا؟ اس کا حال ناظرین کو ہمارے اس ڈراما کے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ جس کا عنوان "مظلوم ورجینیا" ہے۔

مظلوم ورجینیا

(۱)

قوم۔ یعنی عدالت گاہ رومۃ الکبرےٰ میں ڈسم ویر آپیوس کا اجلاس۔
اور سامنے مؤدب ایک صاحب غرض مقدمہ والا لانجینوس کھڑا ہے۔

آپیوس (کبر و نخوت سے) لڑ جھگڑ کے مدتوں کے بعد اب حاصل کیے
ہیں حقوق اپنے۔ کہاں آزادیاں یہ پہلے تھیں؟
پہلے میں تھا اک غریب ادنیٰ سپاہی۔ آج ہوں
حکمران روم۔ اب وہ کون ہے جو چار آنکھ
کر سکے میرے مقابل؟ یا کرے انکار میرے حکم سے؟

لانجینوس (دادب سے) ہے بجا ارشاد حضرت کا

آپیوس (زیادہ اکڑ کے)
حقیقت کچھ نہیں
سامنے میرے ہے ان بطریقوں کی - جو ظلم پہ
ظلم کرتے - اور غلام اپنا سمجھتے تھے غریب
رومیوں کو - اب بدل ڈالوں گا میں قانون وہ
جس سے ہوتا ظلم تھا - اور کھائے جاتے تھے ہیر
روم کے مفلس غریبوں کو

لانجینوس
مگر پہلے حضور
سب ڈسمویروں کو کریں ہمخیال اپنا - کہ جب
پیش ہو یہ مسئلہ تو ساتھ دیں سب آپ کا -

آپیوس (لاپروائی سے)
سب موافق مجھ سے ہیں - سب عقل و تدبیر سے
میری دبتے ہیں - نہیں دبتے ہیں مجھ سے بس وہی
ہوگا جو کہدوں گا میں - تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟
(مونچھوں پر تاؤ دیکے) بادشاہِ روم ہوں میں - سب مرے ماتحت ہیں -

لانجینوس
تو مبارک یہ عروج

(دور جینا ایک خوبصورت لڑکی سامنے سے گذرتی ہے)

آپیوس (در جینیا پر نگاہ شوق ڈال کے)
اہا! کیسی مہ پارہ ہے یہ!
کیسی گل اندام ہے! کیسی حسین و نازنین!
ماہ سیما! مہر وش! چابک خرام! اور گلبدن!

لانجینوس (اُدھر دیکھ کے)
کوئی لڑکی مدرسے جاتی ہے پڑھنے کے لیے -
جانے دیجیے -

آپیوس
کیسے جانے دوں؟ بہت بیتاب ہوں!
دل مرا چھینے لیے جاتی ہے! لینا! دوڑنا!
روکنا! جانے نہ پائے!

لانجینوس
یہ برا ہوگا حضور!
سب بگڑ بیٹھیں گے رومی - اٹھ کھڑا ہوگا فساد -

آپیوس (سخت بیباکی سے) مجھ کو کیا پروا کسی کی! کون ہے؟ جو سرکشی
کر سکے گا؟ تم پکڑ لاؤ اسی دم اسکو یاں۔

لانجینوس گر کوئی روکے تو کیا اُس سے کہوں؟

آپیوس اُنھ! کیا فضول
باتیں کرتے ہو؟ یہ کہہ دینا کہ یہ تو بیٹی ہے
میری لونڈی ہے۔ مری مملوک ہے۔ مالک ہوں میں
روکنے کا حق کسے ہے؟

لانجینوس ہاں لیگا کون اس

آپیوس (بگڑ کے) جھوٹ کو؟
کیونکر نہ مانے گا؟ تمھاری باتوں میں
وہ پہونچ جائے گی اپنے مدرسے۔ رہ جاؤں گا
میں کلیجا تھام کے۔ جاؤ! پکڑ لاؤ! نہیں
تو میں مر جاؤں گا اُسکے شوق میں۔

لانجینوس جاتا ہوں میں۔

(عدالت سے نکل کے دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے)

آپیوس (خود بخود) سچ تو یہ ہے میں بڑا ہی خوش نصیب۔ اقبالمند۔
نیک طالع۔ ذی مراتب۔ صاحب توقیر ہوں
اک تو ہے ایسی حکومت۔ ایسی قدر و منزلت۔
اور ایسی شان و شوکت۔ ساتھ اُسکے یہ حسیں
جب بغل میں میرے ہوگی تب زمانے میں کوئی
ثانی ہو اقبالمندی میں مرا۔ ممکن نہیں۔
مجھ کو کیا پروا کسی کی؟

(لانجینوس ورجینیا کو کھینچتا ہوا لاتا ہے)

لانجینوس لیجیے حاضر ہے یہ۔

آپیوس (آنکھ مار کے) کون ہے؟ اور کس لیے لائے ہو اسکو؟

ورجینیا (چلا کے اور غل مچا کے)

سلے حضور!
میں تو اپنے مدرسے جاتی تھی پڑھنے کے لیے
یہ زبردستی پکڑ لایا مجھے۔ فریاد ہے!
دوڑو اے میرے عزیزو! اور کرو میری مدد!
پھنس گئی ظالم کے پھندے میں ہوں! اور مظلوم ہوں!

(اور جینیا کا چچا نیومیطوریوس۔ اور اقیلیوس جسکے ساتھ اُس کی نسبت ٹھہری ہے ہانپتے ہوے آتے ہیں)

نیومیطوریوس (طیش و غضب سے) اَیں! بھتیجی میری!

اقیلیوس (بیتاب ہو کے) معشوقہ مری! جس سے مری
شادی ہونے والی ہے!

نیومیطوریوس (تلوار کھینچ کے) کس نے اسے چھیڑا بتاؤ؟
جان لے ڈالوں گا میں اسکی اسی دم

اقیلیوس اور میں۔
خون پی لوں گا اسی دم اُس کا

لانجینوس حضرت یہ تو ہے
اک مری لونڈی کی بیٹی۔ جسکو پیدا ہوتے ہی
ماں نے بیماری سے اپنی دیدیا تھا پالنے
کے لیے اس شخص کو۔ اب میں واپس لیتا ہوں
کیا کسی کو دخل اس میں؟ یہ ہے میری ملکیت

آپیوس (نیومیطوریوس سے) کیا جواب اس کا تمھارے پاس ہے؟

نیومیطوریوس (حیرت زدہ ہوکے) بالکل غلط!
جانتا ہوں اسکو بچپن سے۔ یہ میرے سامنے
بھائی کے گھر میں ہوئی پیدا۔ وہیں پھر کھیل کے
یہ ہوئی اتنی بڑی

آپیوس ہے کچھ ثبوت اس کا بھی؟

دعوی ہی دعویٰ ہے خالی

نیومیطوریوس
تو بلا بھیجوں گا میں
باپ کو اسکے جو فوجِ روم کا سنتوریں ؏
ہے۔ وہی دے گا ثبوت۔

آپیوس
اُسکو بلاؤ جلدیاں
ایک ہفتے میں کرے وہ آ کے پیش اپنا ثبوت

لانجینوس
تو رہے جب تک یہ میرے پاس

اقلیوس (تلوار کھینچ کے)
یہ ممکن نہیں

آپیوس (دل میں ڈر کے نیومیطوریوس سے)
خیر تم ہی اسکو لے جاؤ۔ مگر یہ شرط ہے
یہ حفاظت سے رہے۔ اور آج کے دن روز بعد
لا کے حاضر کرو اس اجلاس میں۔ اور ساتھ ہی
پیش کرو اپنے دعوے کے ثبوت۔ اور وہ جسے
باپ اسکا ہونے کا دعویٰ ہے حاضر ہو کے وہ
پیش دعوے کو کرے اپنے۔ کہ اس بارے میں جو
ہوگا حق حق وہ ہی میرا فیصلہ بھی ہوگا۔ اور
حاضری میں تم نے غفلت کی تو اتنا جان لو
فیصلہ یکطرفہ ہو جائے گا قطعی پھر مرا
حکم ناطق ہوگا جو ہو۔

نیومیطوریوس
عذر ہم کو کیا بھلا؟
ہوں گا حاضر لے کے سب اپنے ثبوتوں کو ضرور

(نیومیطوریوس اور اقلیوس ورجینیا کو لے کے جاتے ہیں)
(لانجینوس دوسری طرف جاتا ہے۔ اور عدالت برخاست)

---

(۲)

وہی مقام ہے۔ وہی اشخاص ہیں۔ اور اُنکے علاوہ مرقیا لونڈی ماں

؏ سپاہیوں کا افسر یا جو منصب کیمیدی رکھتا ہو۔

ہونے کی مدعیہ۔ ورجینیوس ورجینیا کا باپ اور اسکی ماں وغیرہ حاضر ہیں۔

آپیوس (لانجینوس سے) تم کو دعویٰ ہے کہ یہ ورجینیا بیٹی کسی لونڈی کی جو ہے تمھاری پاک؟

لانجینوس جی بیشک حضور یہ مری لونڈی کی لڑکی ہے۔

آپیوس ثبوت اسکا بھی کچھ رکھتے ہو؟

لانجینوس حاضر عدالت میں ہے خود میری کنیز جو ہے ماں ورجینیا کی۔

آپیوس آئے میرے روبرو اور شہادت دے۔

لانجینوس وہ حاضر ہے۔

(مرقیا لونڈی آکے کھڑی ہو جاتی ہے)

آپیوس تمھارا نام

مرقیا میں لونڈی ہوں۔ یہ میرے آقا ہیں۔ مرا نام اے حضور مرقیا ہے۔

آپیوس (ورجینیا کی طرف اشارہ کرکے) جانتی ہو اسکو تم؟

جی ہاں۔ مری بیٹی ہے یہ۔ جبکہ یہ پیدا ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں بہت بیمار اور تکلیف میں تھی۔ اِس لیے دے دیا تھا۔

(ورجینیوس کی طرف اشارہ کرکے) ان کی بی بی کو کہ پالیں وہ اسے۔ دی نہیں اولاد تھی انکو خدا نے۔ اور وہ آرزو اولاد کی رکھتی بہت تھیں۔ الغرض

لے کے پالا میری بیٹی کو۔ مگر اب کرتی ہیں
اس سے انکار۔ اور کہتی ہیں کہ ہے یہ اُنکی ہی
پیٹ کی۔ مجھ سے چھڑاتی ہیں مری اولاد کو۔

آپیوس: اور گواہ اس کا ہے کوئی؟

مرقیا: میرے آقا ہیں گواہ
اور بھی ہیں جاننے والے۔ مگر وہ آج کل
روم کے باہر گئے ہیں۔

آپیوس (ورجینیوس سے): ہے تمھارا کیا بیاں؟
دیکھو سچ کہنا۔

ورجینیوس (برہمی سے): یہی مُردار جھوٹی ہے حضور۔

آپیوس (روک کے): گالیاں مت دو۔ یہاں تم ہو کہ وہ ہو۔ کوئی ہو۔
سب برابر ہیں عدالت ہے یہ۔ اور حاکم ہوں میں
میں نہیں اسکا روادار اک گھڑی کو بھی۔

ورجینیوس: حضور!
میرے گھر میں اور میرے سامنے پیدا ہوئی۔
پھر اسے پالا ہمیں نے۔ جانتے ہیں اسکو سب
دوست۔ احباب۔ اور محلہ والے۔ اور میرے عزیز
سب شہادت دینے کو موجود ہیں۔ شک بھی بھلا
اس میں ہو سکتا کسی کو ہے! ہوئی پیدا یہ جب
لوگ جتنے خانداں میں ہیں سبھی موجود تھے۔
اسکی ماں۔ دائی (جنایا جسنے)۔ گھر کی لونڈیاں
وہ پلایا دودھ جس نے۔ اور کھلائی۔ الغرض
سیکڑوں ہی عورتیں موجود تھیں۔ جو جانتی
ہیں کہ ہے ورجینیا بیٹی ہماری۔ سب حضور
دیں گی یاں آکر گواہی صاف صاف

آپیوس اب تم فضول
باتیں کرتے ہو - مگر اس لغو گوئی سے کہیں
کام نکلا ہے؟ بھلا دیکھا کسی نے آنکھ سے
اسکو پیدا پیٹ سے ہوتے تمھاری بی بی کے؟

ورجینیوس دائی حاضر ہے جنایا جس نے تھا-

آپیوس کیا اعتبار
ایسی ادنیٰ عورتوں کا؟

ورجینیوس اور بھی ہیں

آپیوس وہ بھی سب
جھوٹ بکتی ہونگی-

ورجینیوس اس سے شبہہ ہوتا ہے ہیں
ہے عدالت کو نہیں ہمدردی ہم سے -

آپیوس اس جگہ
سب برابر ہیں - نہیں ہمدردی حاکم کو کسی
سے - جو ہو بالفرض تو دونوں فریقوں کو اُسے
دیکھنا یکساں نظر سے چاہیے

ورجینیوس یہ ہے بجا!
لیکن اس بارے میں حضرت غور فرمائیں ذرا
کون دے دے گا بھلا اپنی پیاری ۔ لاڈلی۔
بیٹی کو آسانی سے؟ جو ہے اُجالا گھر کی - نور
آنکھوں کی - ٹکڑا جگر کی - چین سکھ ماں باپ کی
کون سا وہ خانداں ہوگا - جو اتنا بے حیا
بے حمیت ہو کہ چھن جانے پہ اپنی لڑکی کے
صبر کرلے؟ اور خاموشی سے ایسے ظلم وجور
کو گوارا کرلے؟ ہوگی سخت خونریزی ! بڑا

بلوہ ہوگا! ندیاں خوں کی بہیں گی! اور جب
ہم نہ ہوں گے تب کوئی ورجینیا کو باپ اور
ماں کے آغوش محبت سے چھڑائے گا!

اقیلیوس — نہیں!
سیکڑوں جانیں فدا ورجینیا کے نام پر
ہونگی! ارے جائینگے اس جھگڑے میں دونوں فریق!
وہ بھی جو چھینے گا! وہ بھی جسکے وہ آغوش سے
چھینی جائے گی! پھر اُسکے بعد وہ بھی جو اُسے
کھینچنا چاہے گا اپنے شوق کے آغوش میں!
کچھ نہیں آساں ہے یہ!

آپیوس (بگڑکے) — کون ہے یہ؟ جو کہ ہے
ڈالتا میری عدالت اور حکومت پر دباؤ؟
مجکو اندیشہ اسی کی ذات سے بلوے کا ہے
اور نظر آتا فسادی ہے مجھے۔

نیومسطوریوس (اقیلیوس کو روک کے) — مت بولو تم!
(آپیوس سے) ہو نظر انصاف کی اس بارے میں

آپیوس (بگڑ کے) — یعنی کہ تم
غیر منصف جانتے ہو مجکو؟ لیکن میں کبھی
درگزر حق سے نہیں کرتا۔ طرفداری کسی
کی کروں یہ جرم ہے۔ اور میری نسبت یہ خیال
جو کرے توہین کرتا ہے عدالت کی۔ گوارا
یہ نہیں ہو سکتا تھا ہرگز۔ مگر خیر۔ اب معاف
تم کو کرتا ہوں۔ مگر حق سے قدم میرا ہٹے
غیر ممکن ہے۔ سنو اب فیصلہ:۔ میری نظر
میں سراسر زیادتی تم لوگوں کی ہے۔ مرقیا

حق پہ ہے - تم شورہ پشتی اور اپنے زور سے
چاہتے ہو چھین لو - اولاد اُسکی - اور کرو
اُسکو محروم اُسکی بیٹی سے - لہذا میرا حکم
ہے کہ پائے مرقیا ورجینیا کو جو کہ ہے
مستحق پانے کی اُسکے - اور تم سب باز آؤ
اُسکے دعوے سے - ہوئی گر کچھ بھی شورش تو سزا
تم کو دی جائے گی -

ورجینیس (رو رو کے) اب ورجینیا کو میں کہاں
اپنی پاؤں گا؟ کہاں مجھکو ملیگی؟ ہائے! ہائے!
ایسی پیاری بیٹی! یوں چھن جائے! قسمت پھوٹ جائے!

ورجینیا کی ماں ہائے بیٹی! کیا خبر تھی جیتے جی تجھ کو کوئی
چھین لے گا مجھ سے! تیری یاد میں میں ہر طرف
سر پٹکتی - تلملے چیختی - خاک اُڑاتی! اور ہائے!
خون کے آنسو بہاتی! در بدر کی ٹھوکریں
کھاتی - ہر جانب پھرونگی - اور نہ پاؤنگی تجھے!

اپیوس (ڈپٹ کے) گھر میں یوں آنسو بہاتا!
(خدام اجلاس سے) اب نکالو یاں سے ان
لوگوں کو جو شور کرتے ہیں -

(عام حاضرین میں سخت برہمی پیدا ہوتی ہے اور سب لوگ رو رہے ہیں)

ورجینیس (حسرت سے) حضور اب چھٹتی ہے
میری بیٹی - مجھے تو اتنی اجازت ہو کہ میں
رخصتی بوسہ لوں اُسکا - اور لگا لوں چھاتی سے -

اپیوس گرچہ ہیں یہ مکر کی باتیں - مگر خیر - ایک بار
کے لیے تم کو اجازت ہے -

ورجینیس (خطرناک جوش و حسرت سے) مری ورجینیا!

(ورجینیوس ورجینیا کو گلے لگاتا ہے ۔ دونوں روتے ہیں ۔ ورجینیوس اس کی پیشانی چومتا ہے ۔ پھر اپنے رومال سے اُسکے آنسو پونچھتا ہے)

تجھ سے رخصت زندگی بھر کے لیے ۔ یہ آخری
تیرا ہے دیدار ۔ مت رو! فائدہ اس رونے سے؟
جلد ہوگا خاتمہ اس رنج اور اندوہ کا ۔

(گلے لگاتے ہی لگاتے اُسے ایک قسائی کی دوکان کے پاس کھینچ لے جاتا ہے جو سامنے ہی ہے)

اب بچانے کی تجھے بے آبرو ہونے سے ہاے
میری پیاری لاڈلی بیٹی نہیں دنیا میں ہے
کوئی تدبیر ۔ ایسی جو ہووے شرافت کے اصول
کے موافق ۔ بس سوا اسکے ۔

(دوکان سے ایک چھری جھپٹ کے اُٹھا لیتا ہے اور ورجینیا کے سینے میں بھونک دیتا ہے ۔ زخم سے خون کا فوّارہ نکلتا ہے ۔ لڑکی گرتی اور تڑپ کے جان دے دیتی ہے)

آپیوس (گھبرا کے) کیا؟ ظالم یہ کیا؟

ورجینیوس (جان سے ہاتھ دھو کے) وہ جو کرتا ہر شریف ایسے محل پر! ہاں یہی!
آبروریزی سے بچنے کی یہاں تدبیر ہے!
جس جگہ حاکم ہو ظالم! سنگدل! کمذات! اور
بد گہر! جس کو شرافت اور نجابت سے نہ ہو
کچھ بھی مس! ایسی جگہ جینے سے بہتر موت ہی!

قیلیوس (شور کر کے) اب نہیں بچنے کی عزت روم میں! ہے خطرے میں
آبرو!

(بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں)

لوگ (غل مچاتے ہیں) مارو! نکالو! ان ڈسمویروں کو! جو
دشمن عزت ہیں! ساری قوم کے بدخواہ ہیں!

(آپیوس پر ہر طرف سے یورش ہونے لگتی ہے - اور آخرکار وہ ڈر کے اپنا اجلاس چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے)

ورجینیوس (جوش سے) تو وہ بھاگا! بزدلی ظالم کی دیکھو! جس سے صاف
ہوتی ظاہر اُس کی بے ایمانی ہے - اچھا کہاں
ہے وہ لانجینوس؟ تھا جو مدعی؟

(لوگ اُسے ڈھونڈھ کے پکڑ لاتے ہیں)

لوگ (دھمکا کے) سچ سچ بتا؟
کیا تھی یہ ورجینیا بیٹی تری لونڈی کی؟

لانجینوس نہیں
اُس سے واقف بھی نہ تھا - وہ اتفاقاً ایک روز
جاتی اپنے مدرسے تھی اِس طرف سے آپیوس
دیکھتے ہی اُس پہ عاشق ہو گیا - مجھ سے کہا:
تم پکڑ لاؤ اُسے - گر کوئی روکے تو کہو
بیٹی ہے یہ میری لونڈی کی - پھر اپنی چھوکری
مرقیا کو خود سکھا کے بھیجا اُس نے میرے پاس
تاکہ اپنی لونڈی کہہ کر میں اُسے اجلاس میں
پیش کر دوں -

لوگ (جوش سے) ایسا ظالم!

اقیلیوس اور کہاں ہے مرقیا؟

(اُسے بھی لوگ پکڑ لاتے ہیں)

مرقیا ہائے مجھ کو چھوڑ دو -

اقیلیوس (تلوار کھینچ کے) جلدی بتا تو کون ہے؟

(سہم کے) آپیوس آقا ہیں میرے اور میں اُنکی لونڈی ہوں -
جانتی بھی میں نہ تھی ورجینیا کو - اُن کے حکم
سے کیا دعوٰے کہ وہ بیٹی مری ہے -

مجنونانہ طیش سے) پھونک دو
اس عدالت کو! جہاں ایسی دغابازی سے اور
ایسی بے ایمانی سے ہوتی ہو حکومت!

عام لوگ (جوش و خروش سے) ہاں ابھی!
پھونک دو اجلاس یہ! اور کھود ڈالو یہ مکاں!
مار ڈالو سب ڈِسِمویرِوں کو! پائے تاکہ دم
اب نجات ان ظالموں کے ظلم سے اور جور سے

(فورم میں آگ لگاتے ہیں۔ اور شہر میں بلوہ ہو جاتا ہے۔

اسیریِ بابل

بخت نصر سارے بنی اسرائیل کو اسیر کر کے بابل پکڑ لے گیا تھا۔ اُن کے بادشاہ صدقیا کو طوق و سلاسل پہنائے۔ اُس کے بیٹوں کو اُس کے سامنے قتل کرایا۔ لوہے کی گرم سلاخوں سے اُس کی آنکھیں پھوڑیں۔ اور اُسے بابل کے تیرہ و تار قید خانہ میں ڈال دیا۔ پھر اہل بابل یعنی کلدانی بت پرست بنی اسرائیل سے بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح محنت و مشقت کے ذلیل ترین کام لینے لگے۔ اور اس حالت کو مدتیں گذر گئیں۔ یہاں تک کہ اسرائیلی بادشاہ صدقیا قید میں مرگیا۔ اور اُس کے مرنے کے بعد فارسی تاجدار سائرس نے حملہ کر کے کلدانیوں کو تباہ اور بابل کو ویراں و بے چراغ کیا۔ اور بنی اسرائیل کو اپنے وطن ارض یہودا میں واپس آنے کی اجازت دی۔

یہ واقعہ دنیا کے اہم ترین تاریخی واقعات سے ہے جس کے حالات کتب آسمانی سے معلوم ہوئے ہیں۔ انگریزی کے جادو بیاں و نکتہ سنج شاعر گولڈ اسمتھ نے اُنھیں مذکورہ واقعات سے ماخوذ کر کے ایک چھوٹا سا دلچسپ منظوم ڈراما لکھا ہے جس سے تاریخ قدیم کا ذوق رکھنے والوں خصوصاً دلدادگان شریعتِ الٰہی و

رمز شناسان اسرار پیغمبری کو بڑا لطف آسکتا ہے۔ اور مسلمان چونکہ توحید کے عقیدے میں سب سے زیادہ بڑھے ہوے ہیں اور انبیاے سلف کا بے حد ادب کرتے ہیں اس لیے ہمیں امید ہے کہ اُن کو اس ڈراما میں یہود ونصاریٰ سے زیادہ مزہ آئے گا۔

اسی خیال سے مین نے اس چھوٹے سے ڈراما کا ترجمہ اُردو نظم مین کردیا اور ان پابندیون کے ساتھ کہ اصل مضامین بجنبسہ قائم رکھے ہیں۔ ترجمہ ویسی ہی نظم مین ہے جیسی کہ گولڈ اسمتھ نے لکھی ہے۔ اصل ہی کی طرح شعر خوانی ہے۔ نغمے ہیں۔ اُسی نمونے کے اشعار ہیں۔ اُسی شان وترتیب سے قافیے ہین۔ اور وہی رنگ ہے۔ خلاصہ یہ کہ فقط الفاظ تو اُردو ہیں باقی ہر چیز انگریزی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ڈراما کو بھی بہی خواہاں اُردو عموماً اور مسلمان خصوصاً پسند کریں گے۔ قدردانان دلگداز۔ اس تمہید کے بعد اب آپ اس ڈراما کو ملاحظہ فرمائیں۔ اور دیکھیں کہ یہ ڈراما کیسے مورخانہ وقار۔ مذہبی استقلال۔ موحدانہ جذبات اور ادیبانہ کمالات کو ظاہر کر رہا ہے۔

خاکسار محمد عبدالحلیم شرر ایڈیٹر دلگداز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشخاص ڈراما

پہلا اسرائیلی نبی	پہلا کلدانی پوجاری
دوسرا اسرائیلی نبی	دوسرا کلدانی پوجاری
اسرائیلیہ عورت	کلدانیہ عورت

نوجوان مردوں اور دوشیزہ لڑکیوں کے گروہ

پہلا کھیل

(منظر: دریاے فرات کے کنارے۔ قدیم شہر بابل کے قریب)

پہلا نبی (شعر خوانی) اسیرانِ ستم - جو کام کرتے کرتے روتے ہو
فراتِ تیز رو کا شور سنتے ہوش کھوتے ہو
ذرا اس گریۂ و زاری کو چھوڑو اور دم لے لو
خدا سے لو لگا کر دل کو اک تسکین سی دے لو
ذلیل و پا بہ زنجیر - اور دنیا بھر عدو اپنی
خدا ہی کے ہے ہاتھ اب تو امید و آرزو اپنی

وہی (نغمہ) خدا ہی پہ ہے ناز ہم کو زمین پر
اُسی کے کرم پر لگی ہیں نگاہیں
مصیبت بڑھے جتنی قلبِ حزیں پر
بڑھے حوصلہ بھی کہ اس کو نباہیں

دوسرا نبی (نغمہ) نہیں گو کہ آراستہ وہ حرم یاں
نہ قربانیاں اور چڑھاوے ہیں اِس جا
بنے گا حرم اُس کا سینے میں ہر آن
اور اُس پہ دُرِ اشک ہر دم چڑھے گا

(پہلے نغمے کو اسرائیلی مل کر پھر گاتے ہیں)

اسرائیلیہ عورت (شعر خوانی) یہ نغمہ پھر سنانا - جس سے گھر یاد آتا ہے اپنا
کہ نقشہ کھینچے ان آنکھوں کے آگے اپنے موطن کا
زیتوں کے مرغزارو! جو ہو اوڑھے پھولوں کی چادر
وہ کھیتو! اٹھلاتی ندیوں سے لچکا جن کے دامن پہ
پہاڑو! ارضِ لبناں کے! ہے جن پر تاج سرووں کا
درختو لیموؤں کے! جن سے سارا بن مہک اُٹھا
تھے کیسے جانفزا یہ جھنڈ! کیسے پیارے میداں تھے
خصوصاً جبکہ ہم سب موردِ الطافِ رحماں تھے

وہی (نغمہ) یادِ وطن! فریب نہ دے بن کے مہرباں
بے سود و بے نتیجہ ہے ہر وقت ہر گھڑی

پیش نظر ہی رکھنا گذشتہ سروریاں
پھر رنج سے بدل کے اُسے کرنا دشمنی
ظالم ستانے والی! جہاں جا جہاں کہ سب
آزاد اور مستِ شرابِ سُرور ہوں
کمبخت ہم سے جو کہ ہیں خواہاں فضلِ رب
کیا قہر ہے کہ وہ ترے زخموں سے چور ہوں

وہی (شعر خوانی)

مگر کیوں شکوہ؟ گر طوق و سلاسل ہیں تو کیا پروا
دلوں کے جوش پر بھی کیا ہو ان سب قیدوں کا پہرا؟
ہماری شادمانی کے لیے کیا یہ نہیں کافی؟
کہ یاں ہیں بت پرستی سے بچے رہتے فقط ہم ہی؟
ہے آغاز آج ہی کی صبح سے تو یاں کی عیدوں کا
کہ جب سورج کی ان سب مشرکوں میں تھی ہو چکا
ہمارے پُر جفا مالک اُسی دن اپنی رسموں کو
بجا لا کر کرینگے سخت بے شرمی کے کاموں کو
اسی کا غم کریں ہم؟ تا توان نیکی تو پنہاں ہو؟
اور اُسکے بدلے دل پر حکمراں نخوت سے عصیاں ہو؟
نہیں - ہم تو زیادہ خوش ہوں اپنی ایسی حالت پر
کہ تلخی رنج کی غالب نہ آنے پائے ہمت پر

وہی (نغمہ)

جن جن مسرتوں کا بدی پر مدار ہے
انجام اُن کا یہ ہے کہ دل بیقرار ہے
محنت سے نیک پاتے ہیں نیکی یہ جان لو
اور اپنے دُکھ کو چشمۂ لذات مان لو۔
صندل کو بو دُوے گا نہ اپنی وہ بُو کبھی
جبتک کہ جڑ ہے اسکی زمیں میں لگی ہوئی
لیکن اُسے جو کاٹ کے کچلو تو دیکھنا

اک آن میں مہک اُٹھے گی گرد کی فضا

وہی (شعر خوانی) مگر خاموش میرے بچّے! ظالم حاکم آتے ہیں
سُنے میں نے بھیانک باجے جن کو وہ بجاتے ہیں
فضا میں گونجتی ہیں اُلٹی تانیں شادمانی کی
خبر دیتی ہوا ہے ان کی قربت اور روانی کی
یہ بڑھتا شور کہتا ہے آتے ہیں وہ سرعت سے
مرے بچو! بچے رہنا تم اُن لوگوں کی شرکت سے

(کلدانی پوجاری ہیت سے زن و مرد کے ساتھ آتے ہیں)

پوجاری (نغمہ) یارو آؤ! عید کا وقت آگیا
کوئی لذت آج ہم سے رہ نہ جائے
"عیش کو نکلو" ہے سورج کہہ رہا
شہ بھی آتا ہے کہ یاں عشرت منائے

دوسرا پوجاری (نغمہ) شمس ہی کی سی ہے برکت شاہ کی
دونوں رحمت ہیں ہمارے واسطے
شمس سے گر ہے فلک پر روشنی
تو زمین کی روشنی ہے شاہ سے

کلدانی عورتیں (نغمہ) جلدی آؤ مزے کے رسیا
ہو لنا میں پری چہرہ عشق کا تحفا
جھپٹ لو لو اور سب کو چھوڑ دو

کلدانی مرد (نغمہ) ان میں نہ آئے تم کو مزہ گر
جھک پڑو جھٹ پٹ اور مزوں پر
مے ہے مزے کی ترک کرو لب کو

پہلا پوجاری (نغمہ) مے بھی مزے کی حسن بھی پیارا
بیسوں مزوں کا ان سے سہارا
کس کا شوق نہیں ہے سب کو

دوسرا پوجاری (نغمہ) چھانٹوں اس کی کسے ہے فرصت؟
سب کا شوق ہے۔ سب سے رغبت
دونوں کا لطف اٹھاؤں گا شب کو

پہلا پوجاری (شعر خوانی) مگر یہ کیوں؟ کہ سارا ملک ہے جب عیش سے شاداں
اسیران ہوا کر رہے ہیں نالۂ و افغاں؟
بجاؤ کیوں نہ تم اہل ہودا بانسری اپنی
لگے نئے جھاڑیوں میں کیوں تمہارے چنگ ہیں خالی؟
اٹھاؤ بانسری۔ اور چھیڑ دو تم اپنا بھی نغما
سناؤ راگ صبحوں کا تقاضا ہے یہ اس دن کا
بھلا دو غم کو۔ اور تانیں لگاؤ ساتھ ہم سب کے
ضرورت ہے کہ تم سا باکمال اپنی بھی دھن چھیڑے

وہی (نغمہ) جو جو لمحہ آتا ہے
عیش نیا اک لاتا ہے
آؤ۔ تم تو دوڑ آتا ہو
وقت کو مفت نہ جانے دو

(نغمہ) کل پھر ہاتھ نہ آئے گا
آج کا لطف جو جائے گا
آہ! کہ کل پچھتاؤ گے
جیسا کرو گے پاؤ گے

(شعر خوانی) گرفتارِ سلاسل۔ اور ذلیل و پست و خوار ایسے
مشقت میں پھنسے۔ آفت زدہ۔ اور سوگوار ایسے
یہی ہے وقت بیدردو! بھلا گانے بجانے کا؟
شریکِ کار ہاے شرک ہو کر لطف اٹھانے کا؟
نہیں۔ ہرگز نہ ہوگا یہ۔ یہ ہاتھ اسدم ہی غارت ہوں!
جو اُستادِ زماں۔ شاقِ فن ہاے مسرت ہوں!

اگر بھولیں ہم اپنی سرزمیں اور اپنے موطن کو!
کریں یا کام جس سے اتفاقِ لطف زائل ہوا!

دوسرا پوجاری (شعرخوانی) گستاخ غلامو! تم اگر یوں نہ سنو گے
تو یاد رہے سخت مصیبت میں پھنسو گے

پہلا نبی (شعرخوانی) کیا خوف! کرو ظلم! ہمیں بس ہے یہ نعمت
اللہ سے ڈرتے ہیں نہیں اور کوئی دہشت

(سب کلدانی چلے جاتے ہیں)

اسرائیلی گروہ (نغمہ) کیا بدلے گی اس دل کو بھلا قید واذیت
رہتا حرمِ سینہ میں ہے جو بہ حفاظت؟
لغزش نہ ہو اعدا کو دکھا دو یہ تجمل
کہتے ہیں جسے فتح وہ ہے ضبط و تحمل

(سب چلے جاتے ہیں)

دوسرا کھیل

(حسب سابق کلدانی اور بنی اسرائیل - اور وہی اگلا منظر)

پہلا نبی (نغمہ) نورِ ایماں! مرے دل کے ملکوتی مہماں
ساکنِ سینۂ پُرداغ و انیسِ حرماں
مرحمت کر ہمیں تو اپنی دوائے تسکیں
دے وہ پَر جن سے اُڑے قلب سوئے افلاک
خاک کی تیرہ کثافت سے ہوں یہ آنکھیں صاف
اور آزادِ غم و درد سے ہو جائیں حزیں

پہلا پوجاری (شعرخوانی) بس ہو چکا - سرِ امین بہت دیر ہو گئی
ہے حکمِ شہریار کی تعمیل لا بُد ہی
راحت تمھاری شاہ کی فرمانبری میں ہے
دیوتاؤں کو سرا ہو نجات اب اسی میں ہے

لیکن کیا جو شاہ کے فرماں سے انحراف
تو اُس کی مہربانیاں جاتی رہینگی صاف
سوچو۔ تم اپنے سر پہ بلا کیسی لاتے ہو؟
سمجھو۔ کہ کیسا غصہ تم اُنکو دلاتے ہو؟

وہی (نغمہ) طوفان اُٹھا ہے آفت کا
سارے لہراتے سمندر میں
اندھڑ وہ چلا ہے قیامت کا
افریقہ کے دشت و در میں
لیکن طوفان
چرخ شکن ہاں
لاتا ہے گو ہر طرح کی آفت
شاہ کا غصہ
قہر کا جلوہ
ہے سب سے بڑی پُرشور قیامت

اسرائیلیہ عورت (شعرخوانی) ہائے قسمت! کیسے ہیبتناک خطرے بڑھ گئے؟
جان کس وحشت میں ہے؟ اور کیسے یہ صدمے سہے؟
اے نبیو! واقفِ اسرار وصدقِ لم یزل
ہو معاف اک لڑکی کی جرأت میں پاؤ گر خلل
ہائے! دم بھر کے لیے منظور کر لو حکم کو
آنسوؤں سے کل گُنہ کا داغ ہم ڈالیں گے دھو

وہی (نغمہ) ہیں عاجز زندگی سے ہم مگر مرنے سے ڈرتے ہیں
اور اُمید اپنی وہ شامت زدوں کا جو سہارا ہو
ٹھہانے والے دل کے تازے جو صدمے گذرتے ہیں
بڑھاتے اُسکو اتنا ہیں کہ دم ماریں نہ یارا ہو۔
یہ اُمید ایک دُھندلی شمع ہے جو دل میں جلتی ہے

بڑھاتی ہے فقط کمبختوں کی یہ راہ کی رونق
پھر اس پہ یاں تو اک ظالم اندھیری رات طاری ہے
جو کچھ بھی روشنی ہووے تو یہ رکھتی نہیں مطلق

دوسرا پوجاری (شعر خوانی) پھر اب کیا دیر ہے؟ اٹھو شریک جشن عشرت ہو
نگاہیں کہتی ہیں آمادۂ عیش و مسرت ہو
بس آؤ - اور گاؤ ایسا دلکش نغمۂ شیریں
کہ ہو اس جشن کی نام شہ ذیجاہ سے تزئیں
اسیرو - ساز چھیڑو - اور بجاؤ بانسری اپنی
یہ صحبت - یہ گھڑی - یہ جا - ہر اک ہو رنگ میں ڈوبی

کلدانیہ عورت (نغمہ) لو صبح دم کی کرنیں - ہیں آج مسکراتی
شاخیں وہ جھاڑیوں کی ہیں ارغنون بجاتی
چکر نسیم کیا کیا جنگل میں ہے لگاتی
پودھوں میں جا کے نہریں ہیں کھیلتی کھلاتی

پہلا پوجاری (نغمہ) ایسی تو دھوم کا یاں اک جشن ہو رہا ہے
آخر بتاؤ موقع یہ کون رونے کا ہے؟
ہم کو کسی کی پروا اب تو نہیں ذرا ہے
ہم تو وہی کریں گے یہ دن جو چاہتا ہے

دوسرا پوجاری (شعر خوانی) مگر ٹھہرو - وہ دیکھو ان اسیروں کا جو افسر ہے
جو کہلاتا ہے پیغمبر رکھی نے اُسکے لب پہ ہے
بس اب تم دیکھ لینا اسکا جو رتبہ ہے گانے میں
ہر اک دھن کے ادا کرنے میں ہر دل کے رجھانے میں
ہے کیا جذب بیانہ - ذرا دیکھو تو صورت کو
یہ بادل سے بڑھانے والا طوفانوں کی شدت کو
گلے کے سر بھی لو اب مل گئے ہیں چنگ کے سر سے
سنیں گے اس سے اپنے شاہ کے اقبال کے نغمے

پہلا نبی (نغمہ)
اُتر - دکھن - پورب - پچھم -
ہر سمت سے فوجیں آتی ہیں!
ناپاک دلو - اب کانپو تم!
سب فحش زبانیں گونگی ہیں!
ہر سمت سے طوفان اُٹھا ہے
بابل پہ آکے برسنے کو!
خواری! تباہی! اور لُٹنا ہے
رونے! مرنے! سر دُھننے کو!

دوسرا نبی (نغمہ)
پامال کر الٰہی! اور خاک میں ملا دے!
سورج کے ڈوبنے سے پہلے ہو یہ خدایا!
دی ہے سزا جو اس نے وہ ہی اسے سزا دے!
یہ ہو چکا مقرر! اب ہو کے یہ رہے گا!

دوسرا پوجاری (شعر خوانی)
بس - غلاموں سے جو ہووے ایسی گستاخی عیاں
فیصلہ اُس کا کریں گے آپ ہی شاہِ جہاں
نا سمجھ شامت زدو! کیا دیکھا تم سب نے نہیں
صدقیا کی عظمتیں ان ہاتھوں کیسی مٹ گئیں؟
اُس اندھیرے قید خانے کی طرف پھیرو نظر
قید ہے جس میں تمھارا وہ شہِ خستہ جگر
دیکھو زنجیریں سجاتا - آنکھوں سے معذور ہے
غم میں اپنے بیٹوں کے روتا ہے اور محذور ہے
یہ بھی سن رکھو غلامو! ہیں ابھی باقی بہت
بھاری بھاری بیڑیاں اور محبسِ دوزخ صفت

سارے کلدانی (نغمہ)
اُٹھیے شاہِ ذی شان اُٹھیے
قائم کیجیے قوم کی شوکت
ملکوں ملکوں سب کی زباں سے

نکلے حضرت ہی کی مدحت

(سب چلے جاتے ہیں)

تیسرا کھیل

(وہی اشخاص - وہی جگہ - وہی منظر)

پہلا پوجاری (شعر خوانی) ہاں دوستو تقدیر نے بیشک کیا ہے فیصلا
یعنی ہماری سلطنت قائم ہے تا روزِ جزا
مجنوں نبی بیکار ہی دیتا ہے دھمکی خوف کی
اس سرکشی کے جوش میں مخفی عداوت ہے بھری
اپنے تو نام و زور کی شہرت ہی دنیا میں رہے
ہاں عدل اپنا روز بدخواہوں کا سر کچلا کرے

وہی (نغمہ) ہم عمر ہے انسان کی
اپنی بڑی شاہنشہی
اس کو رہے دائم بقا
گو ساری دنیا ہو فنا
جب کچھ نہ دنیا میں رہے
اسوقت یہ بابل مٹے

دوسرا اسرائیلی نبی (شعر خوانی) یوں ہی مغرور کے دل میں خیال خام رہتا ہے
گھڑی بھر بعد دیکھو تو نہ عظمت ہے نہ دعوا ہے
مگر ہیں! کیا ہے وہ غمگیں جلوس دلخراش اُس جا
جو اُس میدان کے رُخ چپکے چپکے ہے چلا جاتا؟
اور اب دیکھو - لیے جاتے ہیں وہ دریا کنارے پر
جنازہ ایک جسکو ہیں اُٹھائے لوگ کاندھے پر
مگر افسوس! میری آنکھوں نے کیا خوب پہچانا
یہودا کی یہ شاہی نسل کا ہے آخری جلوا

ہوئے رخصت ہمارے شاہ سب خطرے بھی رخصت ہیں
جنابِ صدقیا جاتے سوئے آغوشِ تربت ہیں

وہی (نغمہ) بدنصیبو! جنھیں قسمت سے ہے اپنی نفرت
اپنی محتاجی و اندوہ پہ جو روتے ہو۔
پوچھو تو۔ کیسی المناک تھی اُس کی قسمت
اور کرو شکر کہ تم اُس سے بہت اچھے ہو

پہلا نبی (نغمہ) مغرورو! ناز ہے جنھیں عیش و شباب پر
یہ رنگ رلیاں چھوڑ کے اسکو بھی سوچ لو
تم سا تھا ناز اسے بھی بجا اور جناب پر
اِس کا ہی سا تمھارا بھی انجام کار ہو

وہی (شعرخوانی) تم اس شامت زدہ کی غم میں لپٹی لاش تو دیکھو
یہ میلا جسم زنجیروں سے ہر جا خستہ تو دیکھو
یہ حلقے دیکھو جو آنکھوں سے خالی ہیں بھیانک ہیں
بدن پر چیتھڑے اور بال دیکھو جو کمر تک ہیں
مگر کیا آسماں بدلہ نہ لے گا اسکا دشمن سے؟
گرائے گا نہ اُسکو وہ خدنگِ ظالم فلک سے؟
مگر کب تک خدائے دو جہاں یہ جور ٹالے گا؟
بخوبی دھجیاں ہولیں گی تب وہ قہر ڈالے گا

اسرائیلیہ عورت (نغمہ) ہانپتی بھاگتی ہے جیسے کہ زخمی ہرنی
کودتی پھاندتی شیریں و رواں نہروں کو
اور دریا کوئی طے کرکے نشیبی وادی
کرتا حائل رہِ صیاد میں ہے لہروں کو
ویسے ہی ہم بھی مصیبت زدہ ہو کر مولا
شوق میں چشمۂ رحمت کے ہیں بے صبر و قرار
کون چشمہ؟ جو ہو مظلوم کے حق میں مژدا

اور زیر دست ستمگر کو کرے زار و نزار

پہلا نبی (شعرخوانی) مگر یہ شور کیسا ہے؟ معاذ اللہ! ہیں سب حیراں!
وہ دیکھو برج گرنے کو ہے۔ کیسا مچ گیا طوفاں؟
وہ دیکھو۔ کس کا لشکر سارے میدانوں میں ہے پھیلا؟
یہ آ پہونچا ہے سائرس لوٹتا اور مارتا ہر جا
وہ دیکھو۔ ہو رہی ہے مورچوں کی کیسی پامالی؟
خداوندا تری ہی فتح ہے باقی ہیں سب فانی!

اسیروں کا گروہ (نغمہ) پامال کر الٰہی! اور خاک میں ملا دے!
پاداش کا ہو آغاز اس کا ہے وقت آیا
دی جو سزا انھوں نے وہ ہی انھیں سزا دے!
یہ ہو چکا مقرر۔ اب ہو کے یہ رہے گا!

پہلا پوجاری (شعرخوانی) ہوئی بالکل شکست۔ اور لشکر بابل وہ پسپا ہے
وہ سائرس فاتح عالم برابر بڑھتا آتا ہے
دھواں قصروں پہ اُٹھتا اور ہے سیلاب عدو جاری
ہے کیا نخوت کا سر نیچا؟ شجاعت کی ہے کیا خواری؟
خدایا رحم! اُس نے اپنی دعا، گو دیر میں مانگی
ہمیں پچھتانے کو مہلت ملے بس ایک ساعت کی!

دونوں پوجاری (نغمہ) مبارک ہیں وہ جو مبارک گھڑی میں
خدائے جہاں کی طرف لو لگائیں
چھپیں جا کے اُسکے جلالِ قوی میں
نہ پہلے تباہی کے وہ مار کھائیں

دوسرا نبی (شعرخوانی) زمانہ اب ہمارا ہے! جری بیباک دہالو!
خدا سے ڈرنے اور انساں کے آگے بھاگنے والو!
جسے بھولے تھے پہلے اُس سے بیکار التجا ہے اب
تمہاری جانیں۔ دولت سلطنت۔ غارت ہیں سب کی

وہی (نغمہ) اولوسفر! ابنِ صباح پُرخطر
جنت کے اور انسان کے ساتھی قدیم
انسان و جنت اور سب
ہیں تیرے نکبت خواہ سب
اور جانتے ہیں تجھ کو ملعون و رجیم

پہلا نبی (نغمہ) او شہر بابل! کیسا تو غارت ہوا!
اُس اوج سے ہے یہ تباہی سخت تر
سنسان یہ سڑکیں تری
ہوں گی ہجاِ غم سے بھری
یاں بولیں غوک اور بیٹھیں گدھ مُردار پر!

دوسرا نبی (شعر خوانی) یہی انجام ہوا لیکن سنو- واں دور سے کیونکر
خبر دیتی ہے تُرہی اب رُکیں پیکارِ لشکر؟
ہمارا حامیِ اعظم شہِ سائرس ہے آ پہونچا
ظفر پیکر عساکر کے ہے آنے کا یہی رستا
بس اب تم چھیڑ دو دُھن اپنے صیہونِ معظم کی
مبارک باد گا دُو حامیِ اولادِ آدم کی
بحکم رب اسیروں کے چھڑانے کو وہ آتا ہے
ستمگر کے لیے بھاری سلاسل ساتھ لاتا ہے

نوجوان اسرائیلیوں کا گروہ (نغمہ) اُٹھو - اور کہو اپنی بے خانمانی
کہ یادِ الم میں ہے اب ملتی لذت
یہ سائرس ہے اک رحمتِ آسمانی
نصیب اُس سے عالم کو ہو خواب راحت

ع لوسفر (نمیس تارے (زہرہ) کو بھی کہتے ہیں اور شیطان کو بھی- بابلی چونکہ اس تارے کو پوجتے تھے اسی وجہ سے بنی اسرائیل نے اُسکو شیطان کہدیا- چونکہ یہ ستارہ صبح کو طلوع کرتا ہے اس لیے اسکو ابن صباح کہا پھر شیطان کے واقعات اُسکی طرف منسوب کردے-

اسرائیلیہ لڑکیوں کا گروہ (نغمہ) ساگرس ہم کو بچانے والا
الفت و عشرت ساتھ ہیں اسکے
آتا ہے رحمت لانے والا
آتا ہے ہم کو دکھ سے چھڑانے

آدھے اسرائیلیوں کا گروہ (نغمہ) مبارک ہے جو رحم سے حکمراں ہو
رہے صلح اور امن سے اسکو الفت
مبارک ہے جو کھول دے دست پاکو
مگر دل کو کرلے اسیر محبت

سارے اسرائیلی (نغمہ) اپنے حامی اپنے مونس او خداوند کریم!
حمد سب گاتے ہیں دل سے سرمدیت کی تری
تو کہ ہے بے ابتدا بے انتہا ذات قدیم
ہو تجھی میں ابتدا اور انتہا ہم لوگوں کی

(سب جاتے ہیں)

بنی اسرائیل کی مختصر تاریخ

حضرت ابراہیمؑ سے جب وطن چھوٹا تو چند روز سرگردانی کے بعد آپ ارض کنعان میں مقیم ہو گئے۔ آپ کے پوتے حضرت یعقوب اپنے گم شدہ فرزند حضرت یوسفؑ کی وجہ سے پورے خاندان کے ساتھ مصر میں جا کے فروکش ہوے - وہاں اُن کے بارہ بیٹوں سے اُن کی نسل بڑھنا شروع ہوئی - جو بارہوں بیٹوں کی نسبت سے بارہ سبطوں یعنی قبیلوں میں منقسم تھی - اور چونکہ حضرت یعقوب کا لقب اسرائیل تھا - اس لیے سب "بنی اسرائیل" کہلاتے تھے - چند روز بعد اُنکی نسلوں کو بے حد بڑھتے دیکھ کر مصر والوں یعنی قبطیوں اور اُنکے فرمانروا فرعونوں نے اُن پر طرح طرح کے ظلم شروع کیے - اس ظلم کے دور کرنے کے لیے اُنھیں میں سے خدا نے حضرت موسیٰؑ کو مبعوث کیا - اور وہ سارے بنی اسرائیل کو فرعون

کے پنجے سے چھڑا کر اپنے قدیم آبائی وطن ارض کنعان کی طرف لے چلے۔ مصر سے اس نکلنے کو خروج کہتے ہیں۔ جو باختلاف روایات ولادت حضرت محمد مصطفیٰ صلعم سے ۲۰۶۱ یا ۲۱۰۷ سال پیشتر ہوا۔ بنی اسرائیل کتنی مدت تک مصر میں رہے؟ یہ بھی مختلف فیہ ہے۔ بعض روایتوں سے ۴۳۰ سال اور بعض روایتوں سے ۲۱۵ سال معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت یعقوب مع اہل و عیال کے مصر میں ولادت سرور عالم علیہ السلام سے ۲۲۷۶ یا ۲۳۸۶ یا ۲۴۹۱ یا ۲۲۰۱ سال پیشتر تشریف لے گئے تھے۔

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کے نکلے تو مگر زندگی میں ارض کنعان یعنی خدا کی وعدہ کی ہوئی سرزمین میں پہونچنا نہ نصیب ہوا۔ چالیس سال کی دشت نوردی کے بعد ان کی قوم ارض کنعان میں پہونچی اور چند روز میں اس پر قابض و متصرف ہوگئی۔ اب اُن میں ایک طرح کی جمہوریت تھی۔ یہاں تک کہ اُن کی تمنا کے مطابق اُن میں سلطنت قائم ہوئی۔ پہلا بادشاہ ساؤل (طالوت) ہوا۔ اسکے بعد حضرت داؤدؑ بادشاہ ہوے جو اُس کے داماد تھے۔ اور پھر حضرت سلیمانؑ تخت نشیں ہوے۔ جنھوں نے ولادت محمدیؐ سے ۱۶۸۸ سال پیشتر مسجد اقصیٰ یعنی حرم الہٰی کو تعمیر فرمایا۔

حضرت سلیمان کے بعد ارض فلسطین میں جس کا مستقر بیت المقدس تھا اُن کے بیٹے رحبعام تخت نشین ہوے۔ اور فقط دو سبط اُن کے زیر فرمان رہے۔ دس سبطوں نے اُن کے شمال میں ایک جداگانہ سلطنت قائم کر لی۔ جس کا مستقر شہر سامرہ تھا۔ اس سامرہ کی اسرائیلی سلطنت کا خاتمہ تاجدار نینوا شلما نصر کے ہاتھوں ولادت محمدیؐ سے ۱۲۹۱ سال پیشتر ہوا۔ اور وجہ یہ ہوئی کہ سامرہ کے پچھلے اسرائیلی بادشاہ ہوشع نے نینوا کی باجگزاری قبول کرنے کے بعد فرعون مصر "سو" سے سازش کرنی چاہی تھی۔ جس کی سزا میں شلما نصر نے ہوشع کو قتل کیا۔ اور دسوں سبطوں کو مع زن و فرزند پکڑ لے گیا۔ اور آج تک پتہ نہیں کہ یہ دسوں سبط کیا ہوے اور کن قوموں میں کھپ گئے۔ دوسری سلطنت بیت المقدس کا خاتمہ بابل کے فرمانروا بخت نصر کے ہاتھ سے ۱۱۶۹

سال قبل ولادت سرورِ عالمؐ ہوا۔ بخت نصر نے اُن کے بادشاہ صدقیا کے بیٹوں کو قتل کیا۔ اُس کی آنکھیں پھوڑ دیں۔ اور اُسے اور اُس کی قوم یعنی باقی ماندہ دو سبطوں کو مع عورتوں اور بچوں کے بابل میں پکڑ لایا۔ اور اُن سے غلامی کی محنت لی جانے لگی۔ یہاں تک کہ ۵۳۸ قبل محمدؐ میں سائرس نے آکر بابل کو تباہ کیا۔ اور بنی اسرائیل بیت المقدس میں واپس آئے۔ جس وقت کی تصویر اس ڈراما "اسیریِ بابل" میں دکھائی گئی ہے۔

96

نیچرل شاعری

ان دنوں عموماً انگریزی دانوں کو انگریزی مذاق کے امتزاج کی بدولت اردو شاعری میں ایک خاص قسم کے تغیر کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زبان کو انسان باضابطہ اصول و قواعد کے ساتھ پڑھتا ہے۔ جس کی صرف و نحو اور جس کی فصاحت و بلاغت اور شان انشاپردازی کے نکات کو حاصل کرتا ہے اُسی زبان کا مذاق اُس کی طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔ اور اُسے اُس زبان میں جس قدر لطف آنے لگتا ہے خود اپنی زبان میں نہیں آتا۔ اگرچہ اپنی زبان کو وہ سمجھتا زیادہ ہے مگر اُسکے محاسن اور اُس کی خوبیوں پر اُس کی نظر نہیں پڑ سکتی۔ اگر اردو زبان کو بھی ہمارے نوجوان اُس طرز سے پڑھتے جس طرح کہ انگریزی یا دیگر زبانوں کو پڑھتے ہیں تو شاید متاثر طور پر اُنھیں معلوم ہو سکتا کہ خود اردو کے خزانۂ ادب میں کیا کیا خوبیاں اور کیسے کیسے لطف ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اردو زبان میں قریب قریب ہر علم و فن کی کتابیں تصنیف ہو گئیں اور نہیں تصنیف ہوئیں تو اُس کے نحو و صرف کی یا اُس کے معانی و بیان اور علم فصاحت و بلاغت کی۔ اور جب اس قسم کی کتابیں ہی نہیں ہیں تو یہ علوم پڑھائے کیونکر جائیں۔ بعض حضرات نے نحو و صرف کے دو ایک رسالے تصنیف فرما دیے ہیں مگر اُن کو اس سے زیادہ وقعت نہیں کہ عربی یا انگریزی کے نحو و صرف سے ترجمہ کر لیے گئے ہیں۔ ایسی کتاب ایک بھی نہیں ہے جو اردو زبان پر غور کر کے اُس کی ترکیبوں اور بندشوں اور ترتیب الفاظ کو پیش نظر رکھ کے لکھی گئی ہو۔ لہٰذا اس نقصان کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو جتنا ادبی ذوق غیر زبانوں میں پیدا ہوتا ہے خود اپنی زبان میں نہیں پیدا ہوتا۔

اردو نے دو مختلف اور متضاد زبانوں میں دو قسم کے رنگ دیکھے۔ اور اُسکی دو حالتیں رہیں۔ پہلے زمانے میں طلبہ عموماً فارسی زبانوں کی باضابطہ تعلیم پاتے تھے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خود اپنی زبان کی خوبیوں کی طرف

توجہ کرنے کی عوض وہ عموماً اُردو مین اُن محاسن اور لطفون کے پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے جنھین اُنھون نے فارسی عربی مین نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا - اپنی زبان کو وہ روز بروز اُنھین نقش و نگار اور گل بوٹون سے سجے جاتے تھے جن کو اُنھون نے فارسی و عربی کے باغون سے لیا تھا - وہی تشبیہات وہی استعارات - وہی رموز و کنایے - اور وہی عالی خیالات جو اُن زبانون مین تھے اس مین بھی پیدا کیے گئے - اور اسی قسم کا تناسب الفاظ اُردو کا بھی زیور سمجھا جانے لگا جیسا کہ فارسی و عربی کا زیور تھا -

اب اسکے بعد دوسرا زمانہ شروع ہوا جبکہ انگریزی کی تعلیم بڑھنا شروع ہوئی اور ہندوستانی طلبا کے دل و دماغ پر انگریزی مذاق حاوی ہونے لگا - اس دور مین اگرچہ اُردو کا کتب خانہ بہت وسیع اور مالامال ہوگیا - اور ہر علم و فن کی کتابین اس زبان مین تصنیف ہوئین - مگر اُردو کی تعلیم مین وہی نقص بدستور باقی ہے کہ اسکی نحو و صرف اور اس کی فصاحت و بلاغت کی طرف کوئی خاص توجہ نہین کی جاتی - اب بجاے عربی و فارسی کے طلبہ انگریزی کو پڑھنے لگے اور اپنے قومی مذاق کے عوض اُن کے دل و دماغ پر یورپ کا مغربی مذاق حاوی ہونے لگا اُنھون نے انگریزی کی لسانی خوبیون اور مغربی انشا پردازی کے رنگ کو دیکھا اور جس طرح دور اولین والے اُردو مین عربی و فارسی کی لطافت کو ڈھونڈنے لگے یہ انگریزی کی خوبیون اور دلچسپیون کو ڈھونڈھنے لگے - مگر خود اپنی زبان کی ذاتی خوبیون سے جس طرح پہلے دور والے ناواقف تھے یہ بھی ناواقف ہین -

ان دونون زمانون کی حالت دیکھنے اور سمجھنے کے بعد یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ جس تغیر کی ضرورت فی الحال محسوس ہوتے لگی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ گروہ جو فارسی و عربی کے مذاق اور اُسکی انشا پردازی کے ذوق سے ناواقف ہے - چاہتا ہے کہ اُردو انشا پردازی مین وہ لطف اور دلچسپیان پیدا ہون جو انگریزی مین انھین نظر آتی ہین - جس کو اگر ہم زیادہ واضح اور نمایان طور پر بتانا چاہین تو یون کہ سکتے ہین کہ یہ نئی جماعت جس قسم کا تغیر و تبدل اپنے اخلاق و عادات اپنی وضع و لباس اپنی معاشرت و صحبت مین کرتی جاتی ہے اُسی قسم کا تغیر

زبان میں بھی چاہتی ہے۔

ان نئے ترمیم و تغیر چاہنے والوں سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تم زبان میں کس قسم کا تغیر و تبدل چاہتے ہو تو اور کوئی ایسا جواب جس سے اُن کا مافی الضمیر اور ان کا مفہوم ہمارے ذہن نشین ہو جائے ہرگز نہ دے سکیں گے۔ اور وجہ یہ ہے کہ صاف صاف الفاظ میں یہ تو کہہ نہ سکیں گے کہ ہم اُردو کو انگریزی بنا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ہاں یہ کوشش کریں گے کہ اپنی اسی خواہش کو ایسے الفاظ میں ادا کریں جن سے ظاہر ہو کہ یہ کسی کی تقلید نہیں چاہتے بلکہ اپنی زبان میں ایک مہذب اور موجہ انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے "نیچرل شاعری" کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہم اُردو میں ایسی شاعری چاہتے ہیں جو نیچرل ہو۔

مگر "نیچرل شاعری کیا چیز ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارے نو عمر انگریزی دانوں کو مشکل ہوگا۔ کیونکہ جو حقیقی تغیر اُن کے ملحوظ خاطر ہے وہ صرف اتنا ہی نہیں کہ اُردو شاعری میں فطرتی جذبات پیدا ہوں، بلکہ وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ اُردو میں نیچرل جذبات کب نہ تھے۔ میر سے لے کے داغ کے زمانے تک کوئی شاعر نہیں گذرا جس کے کلام میں ایسے اشعار نہ پائے جاتے ہوں۔ جن میں نیچر کے جذبات اچھی طرح موجود نہ ہوں۔ صرف اسی قدر نہیں اُردو شاعری کی عمر کے ہر دور میں ایسے شاعر موجود رہے جو صرف فطرتی جذبات اور نیچرل مذاق ہی کے دلدادہ تھے۔ خصوصاً ہمارے فخر ہندوستان شاعر داغ دہلوی نے تو نیچر کو سامنے کے اور پیش پا اُفتادہ معاملات کے ذریعہ سے اس خوبصورتی کے ساتھ دکھایا ہے جس سے زیادہ ترقی کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر جب یہ رنگ شروع ہی سے اُردو میں موجود ہے تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اور کون سا نیچرل تغیر چاہا جاتا ہے؟

اس معمے کے حل نہ ہونے یعنی انگریزی دان طلبہ کی خیالی نیچرل شاعری کا مطلب سمجھ میں نہ آنے کی یہ برکت ہے کہ مختلف لوگوں میں نیچرل شاعری کے مختلف معنی سمجھے جاتے ہیں۔ بعض حضرات قومی شاعری اور خواجہ الطاف حسین صاحب

حالی کے رنگ ہی کو نیچرل شاعری خیال فرماتے ہین بعض حضرات نے اخلاقی نظمون کا نام نیچرل شاعری رکھ لیا ہے - وہ نصیحتانہ اشعار کہتے ہین اور اُنکو نیچرل شاعری کے لقب سے پبلک کے سامنے پیش کرتے ہین - بعض لوگ جو انگریزی میں زیادہ استعداد رکھتے ہین اُن کے خیال مین نیچرل شاعری اسکا نام ہے کہ جو عنوان انگریزی شاعری کا ہے جو استعارات و تشبیہات انگریزی مین استعمال کیے جاتے ہین انکو اُردو مین استعمال کرنا - اور اُردو اشعار مین یہ شان پیدا کردینا کہ وہ انگریزی اشعار کا ترجمہ معلوم ہون نیچرل شاعری ہے - لیکن ایسی شاعری کو عام اس سے کہ وہ بُری ہو یا بھلی بجاے "نیچرل شاعری" کے "انگریزی شاعری" کہنا شاید زیادہ موزون و مناسب ہوگا -

نیچرل شاعری جہان تک ہم خیال کرتے ہین اُردو مین بہت کچھ موجود ہے - اگر اساتذۂ سخن کے دیوانون مین سے ایسے اشعار چُن لیے جائین جن مین کوئی خیال بہت سادگی کے ساتھ بندھ گیا ہے - یا جن مین سوز و گداز جوش دل یا حُسن دلفریب کی سچی تصویرین نظر آگئی ہین تو ہم سمجھتے ہین نیچرل رنگ کے کلام کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہوجائے گا اور اُن اشعار سے ہزار درجہ اچھا ہوگا جنھین آج کے نئے خیال والے "نیچرل شاعری" کا نام لے کے مُلک کے سامنے پیش کر رہے ہین - مگر نیچرل رنگ کو ترقی دینے کے لیے ضرور ہے کہ عام شاعری من سے غزلیت کی قید اُٹھا دی جائے - غزل اصل مین خیال آفرینی اور قادر الکلامی کی مشق کے لیے ہے - اس لیے نہین کہ شاعری کا اصلی مقصود قرار دے دی جائے - اثر کلام مین اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب موجودہ قیود کو دور کرکے چھوٹے چھوٹے پُر اثر اور جوش پیدا کرنے والے واقعات قطعات مثنوی یا مسدس و مخمس کی حیثیت سے نظم کیے جائین - اور مشاعرون یا گلدستون مین بجاے اسکے کہ قافیہ پیمائی اور تُک بندی کے لیے الفاظ دیے جائین - عمدہ خیالات اور پُراثر واقعات دیے جایا کرین - جتنی توجہ ہمارے نوجوانون کو غزل گوئی کی طرف ہے اُتنی ہی توجہ اگر اس قسم کے سچلبون کی طرف ہو جائے تو چند ہی روز مین نظر آجائے گا کہ شاعری کیا سے کیا ہوگئی اور کہان سے کہان

جا پہونچی۔
ایسی نظمیں کہنا غزل گوئی سے کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ مگر بات کیا ہے کہ لوگوں کو غزلیں کہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور کسی واقعہ کی موزون کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ صرف عادت نہ ہونے کی وجہ سے کسی قدر دشواری معلوم ہوتی ہے جو تھوڑی ہی توجہ سے دُور ہو سکتی ہے۔ لیکن توجہ نہ کرنے کا کوئی علاج نہیں۔

مگر اس قسم کی نظمیں کہنا یا شاعری کے رنگ اور مذاق میں کسی قسم کا تغیر تغیر پیدا کرنا سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ ملکی طلبہ کو اُردو زبان اصول و ضوابط کے ساتھ اور لیاقت پیدا کرنے والے طریقے سے پڑھائی جائے۔ اب ہر علم و فن کی کتابیں بھی اُردو میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ہر قسم کی ضرورت ایک حد تک اُردو ہی کے ذریعے سے پوری ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ نقصان ہے تو وہی نحو و صرف معانی و بیان اور ادبی کتابوں کا۔ جو لائق مصنفوں کی تھوڑی سی توجہ سے دُور ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات کو پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جب تک اُردو زبان باضابطہ طور پر ملکی طلبہ کو نہ پڑھائی جائے گی اُس وقت تک اُن میں وطنی زبان کی قدر کرنے کی لیاقت نہیں پیدا ہوگی اور دوسری زبان کے لٹریچر کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ اپنے لٹریچر کو ہیچ اور پوچ سمجھیں گے۔ اگر غور سے دیکھیے تو اُردو زبان میں کوئی خوبی نہیں جو موجود نہ ہو۔ اُس میں بہت ہی اچھے اور خوبصورت محاورات ہیں۔ اُس میں ہر قسم کی نزاکتیں اور صنعتیں ہیں۔ الغرض جتنی لٹریری خوبیاں کسی زبان میں ہو سکتی ہیں ہماری زبان میں بھی موجود ہیں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ نوجوانوں میں تعلیم کے ذریعے سے اُن خوبیوں کے سمجھنے اور اُن سے لطف اُٹھانے کا مادہ پیدا کیا جائے۔

از ماست کہ بر ماست

من و سلویٰ کا نام زبان پر آتے ہی خوش اعتقاد اور بے نیاز خدا ترسوں

کے منہ مین پانی بھر آتا ہوگا - اور واقعی جب وہ خدا کی نعمتین تھین تو مزہ دار بھی ضرور ہون گی - مگر بنی اسرائیل چند ہی روز مین اس نعمت الٰہی سے اُکتا گئے - اور کہا ہمین تو کھانے کے لیے زمین کی پیداوار ملنی چاہیے " - خیر خدا نے اُن کی یہ احمقانہ آرزو پوری کر دی - مگر جب وہ کھیتون پہ ہل چلاتے - بیلون کی دُم مروڑتے - اور جوتتے بوتے کو کھڑے ہوے ہون گے اور سر کا پسینہ ایڑی کو پہونچا ہوگا - اُسوقت ممکن نہین کہ نہایت ہی حسرت واندوہ کے ساتھ نہ کہہ رہے ہون کہ یہ سب اپنا ہی کیا دھرا ہے - اور " از ماست کہ بر ماست " -

اسی ایک واقعے پر منحصر نہین - بنی اسرائیل کو اُن کے عروج کے زمانہ مین زیادہ تر اسی بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ جتنی بلائین اور آفتین آتی ہین اور جتنی مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے سب اپنے ہی دنیاوی اعمال کا نتیجہ ہین وہ " ری ٹری بیوشن " کے قائل تھے - یعنی اعتقاد رکھتے تھے کہ ہر برے بھلے کام کا بدلہ دنیا ہی مین مل جاتا ہے اور اگر خدا گناہ کی سزا دینے مین دیر لگائے تو توبہ کرنے کے لیے خود ہمین کو اپنی زندگی ختم کر دینی چاہیے - یہ اصول اگرچہ بعض حالتون مین بظاہر اسباب پورا نہین اُتر سکتا - مگر اس مین بھی شک نہین کہ اکثر انسان اپنی ہی بد اعمالیون کے بھگتنے پر مجبور ہوتا ہے - آخری مذاہب نے اگرچہ جزا و سزا کو اُس دوسری زندگی سے وابستہ بتایا تو کوئی مضائقہ نہین - بیشک انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کا بدلہ پائے گا - مگر کچھ ضرور نہین کہ اپنے حرکات و سکنات کا پھل اس دنیا مین بھی نہ پائے -

اصل یہ ہے کہ جن امور کو محض خداشناسی اور رموز توحید سے تعلق ہے یا یون کہیے کہ جن باتون کا معاملہ صرف خدا کے ساتھ ہے اُن مین ہم ثواب یا سزا اُسی عالم مین پائین گے جس عالم سے کہ اُن امور کو تعلق ہے - مگر خلاف جرائم جن سے ہم دُنیا والون کو ضرر پہونچاتے یا دنیا مین فتنہ و فساد پیدا کرتے ہین اُن کی پاداش ضرور ہے کہ ہمین دنیا ہی مین مل جائے - ہم کسی پر ظلم کرین تو یقین کر لینا چاہیے کہ کوئی ہم پر بھی ظلم کرے گا - ہم کسی کو ستائین تو دل مین سوچ رکھین کہ ہمین بھی کوئی ستائے گا - ہم کسی کی توہین کرین تو

خوب جان لین کہ کوئی ہمین بھی ذلیل کریگا - اور ہم کسی کو نقصان پہنچائین تو اس مین ذرا بھی شک نہ کرین کہ کبھی کسی کے ہاتھ سے ہمین بھی نقصان پہونچے گا -

اخلاقی اور دنیاوی جرائم کا جو باہمی ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے اُسکی زیادہ نمایان اور واضح تصویر ہمین اُن شخصی سلطنتون مین نظر آسکتی ہے جن مین بادشاہ کی زبان ہی قانون ہوتی ہے - اور جہان فرمانروا کی ادنیٰ برہمی یا مسرت جان ستانی یا جان بخشی کا کافی بہانہ ہوتی ہے - جو برتاؤ فرمان روا اپنے دربار والون کے ساتھ کرتا ہے جس نظر سے اُنھین دیکھتا ہے - جس ادب و تعظیم کا اُن سے خواستگار ہوتا ہے اُنھین تمام باتون کو اُسکے درباری جو تمام رعایا کے مقابلے مین معزز و محترم خیال کیے جاتے ہین اپنے ماتحتون اور ملازمون سے چاہتے ہین اور یہی سلسلہ درجہ بدرجہ انسان کے ہر درجے سے لے کے ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے تک پہونچتا ہے - یہان تک کہ ہر شخص اپنے بچون - اپنی بی بی اور اپنے دست نگر عزیزون سے اُسی ادب و تعظیم کا خواستگار ہوتا ہے جو ہمین تخت شاہی اور دیہیم خسروی کے آگے نظر آئی تھی - یہ رنگ دیکھنے کے بعد اب تم نیچے کے طبقے سے ہر درجے کے معزز لوگون کو دیکھتے ہوے چلو تو تم کو عجب سیر نظر آئے گی اور دیکھوگے کہ ہر شخص ماتحتون کو ذلیل کرنے کے بعد جب بالادست لوگون کے سامنے جا کے ذلیل ہوگا تو تم اُسے زبان حال سے یہی کہتے سنوگے کہ "از ماست کہ بر ماست"! کیونکہ وہ جو کچھ کر چکا ہے اُسی کا خمیازہ بھگت رہا ہے - صرف آخری اور سب سے بلند درجے مین پہونچ کے تمھین ایک ذات بادشاہ کی البتہ ایسی نظر آئے گی جو بظاہر سب کو ذلیل کرتا ہے اور اُسے کوئی ذلیل نہین کرتا - مگر اُسکی حالت کو اگر غور سے دیکھو تو اصل مین وہ سب سے زیادہ ذلت اُٹھا رہا ہے - اول تو خدا کی طرف سے بیماریان پریشانیان آفتین اور مصیبتین غرض جتنی بلائین آتی ہین سب اُسکے حق مین انتقام کی صورت بن کے آتی ہین - مگر نہین - انکے علاوہ سب سے زیادہ اُسے ذلیل کرنے والا اور ہر وقت ملامت کرنے والا اُس کا کانشنس ہے - جو ہر گھڑی

ایک آفت کی طرح اُس پر مسلط رہتا ہے - اور اُس کی ہر غلطی - اُسکے ہر ظلم اور اُسکی ہر شہوت پرستی کو ایک نہایت ہی مہیب جامہ پنہا کے اُس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اُسکے حق مین ایک دُنیاوی عذاب بن جاتا ہے - اور ممکن نہین کہ آزادو تکلیفون سے گھبرا کے کبھی کبھی اُسکی زبان سے یہ کلمہ نہ نکل جاتا ہو کہ "ازماست کہ بر ماست"۔ سچ یہ ہے کہ اگر ہم غور و تعمق کی نظر سے دیکھین تو صاف نظر آجائے گا کہ اُس عالم آخرت کے دوزخ سے پیشتر خدا نے ہمارے لیے دنیا مین بھی ایک سخت اور نہایت ہی اذیت رسان دوزخ بنا رکھا ہے - جسکے عذاب سے شاذ و نادر ہی کوئی بچ سکتا ہے -

Checked 1987

شادی و غم

اِن الفاظ سے یہان ہماری مراد منشی عاشق حسین صاحب کا ناول "شادی و غم" نہین ہے جسے بابو جے نرائن صاحب فی الحال از سر نو چھپوا رہے ہین - بلکہ اصل مین ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان الفاظ کے اثر پر نظر ڈالین - اور دیکھین کہ فلسفیانہ طور پر قدرت نے اُنھین کس ترتیب سے رکھا ہے -

دنیا مین کوئی چیز اور کوئی جذبۂ انسانی نہین ہے جس مین اسی قسم کی دو مخالف و متضاد کیفیتین نہ ہون - وہی نسبت جو دوزخ و جنت - اعلیٰ و ادنیٰ - لطیف و کثیف - مزے دار و بے مزہ - پُر لطف و بے لطف - اور اچھے اور بُرے مین ہے وہی ان دونون لفظون مین بھی ہے - دُنیا مین کوئی کیفیت اور کوئی حالت نہ ہوگی جو اسی قسم کی دو متقابل جہتون اور ضدون کی تابع نہ ہو - اور شاید اسی فلسفہ پر نظر کر کے زرتشتی مذہب کے عقلمندون نے نور و ظلمت کا اصول قائم کر کے ایسی تمام کیفیتون کو اُسی کے تابع کر دیا - اگرچہ اس مین زیادہ بہک ہونے سے وہ اس عظیم الشان غلطی مین مبتلا ہو گئے کہ خدا اور شیطان کو بھی ایسی ہی دو متباین و متضاد

تو تین تسلیم کر لینے سے وہ دو خداؤن کے قائل ہو گئے۔ اور ان لوگون کی اصطلاح مین جو سچی توحید اور قوت یزدانی کے سب سے بالاتر ہونے کے معتقد و معترف ہین ثنوی یعنی دو خداؤن کے ماننے اور مشرک ہونے کے ملزم ٹھہرے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر کیفیت اور ہر چیز مین یہ متضاد صورتین محض اس لیے پیدا کی گئی ہین کہ بغیر اس کے ایک دوسرے کا حسن و قبح معلوم ہی نہین ہو سکتا۔ دن اس لیے دن ہے کہ رات کے بعد آتا ہے۔ اور رات اس لیے رات ہے کہ دن کے بعد آتی ہے۔ پھر ان دونون کا باہمی مقابلہ ہر شخص کو اپنے خیال و مذاق کے مطابق اس امر کا فیصلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ دونون مین سے کون اچھا ہے اور کون برا۔ اور یہی حالت اور نسبت اسی طرح کی تمام کیفیتون مین خیال کر لیجیے۔

فلسفیون مین ایک نازک بحث پیدا ہوئی ہے کہ دنیا مین خوشی زیادہ ہے یا غم۔ مگر غور اور انصاف سے دیکھیے تو یہ بحث ہی ایسی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ دنیا مین دن زیادہ ہے یا رات زیادہ ہے۔ اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دونون کے سر چشمے خدا نے یکسان درجے پر سیر اور کبھی نہ خشک ہونے والے پیدا کیے ہین۔ مگر ہان یہ ہماری استعداد اور قابلیت کا نتیجہ ہے کہ ان مین سے کس کو اور کس مقدار مین حاصل کرتے ہین۔

جو لوگ صوفیہ کے خیالات سے زیادہ متمتع ہین اور خاصۃً وہ جو دنیا کی ہر چیز کے چھوڑ دینے کو حقیقت و مذہب تصور کرتے ہین۔ ان کا اکثر یہ دعویٰ ہوتا آتا ہے کہ انسان کو خوشی بہت کم ملی ہے اور غم زیادہ۔ وہ انسانی افکار و ترددات۔ زندگی کی مشکلون اور دشواریون۔ اس عالم ہستی کی ناکامیون اور مایوسیون کو پیش کر کے کہتے ہین کہ دنیا دار المحن ہے۔ اور اس مین بمقابلۂ رنج و الم خوشی بہت ہی کم ہے۔ ان لوگون کا یہ خیال قریب قریب ان لوگون کا سا ہے جو اپنے تمام افعال و اعمال کو قسمت کے محول کر کے ہاتھ پاؤن چھوڑ کے بیٹھ رہنے کے مؤید ہین۔

گروہ گروہ جو دنیا کے "مزرعۃ الآخرۃ" ہونے کا قائل ہے ایسی پست ہمتی اور ایسے معطل محض بن جانے کے خیال کی تائید نہیں کر سکتا۔ واقعی جب خدا نے خوشی اور غم کے خزانوں کو یکساں طور پہ مملو و معمور بنا کے ہمیں ان پر متصرف کیا ہے تو پھر یہ کہنا کہ ہمیں غم زیادہ دیا گیا ہے بظاہر ایک ناشکری کا سا خیال ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہمیں خوشی یا غم ان دونوں میں سے جو چیز نصیب ہوتی ہے وہ خود اپنے ہی ہاتھوں نصیب ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے حالات پر غور کرو۔ اپنی ضرورتوں کو نکتہ چینی کی نظر سے دیکھو۔ اور اس بات کو خیال کرو کہ جن چیزوں کی احتیاج و ضرورت کے ہم دعویدار ہیں اُن میں سے حقیقۃً کتنی ضروری ہیں اور کتنی غیر ضروری۔ دنیاوی تکلفات میں پڑ کے۔ تعلقات کو بڑھا کے اور اپنے حوصلوں اور اپنی آرزوؤں کو فضول وسعت دے کے ہم نے اپنی یہ حالت بنا لی ہے کہ ہوس کا دامن کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اور زندگی کی کوئی گھڑی ایسی نہیں ہوتی جس وقت ہم کسی ضرورت کو نہ محسوس کر رہے ہوں۔

مسرت کیا چیز ہے؟ نہ روپیہ ہے نہ پیسہ ہے۔ نہ عالیشان قصر و ایوان ہیں۔ نہ خدم و حشم ہیں۔ نہ حکومت و سطوت ہے۔ اس لیے کہ اگر ان چیزوں سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی تو ہم کسی بادشاہ و امیر کو کبھی ملول و افسردہ نہ پاتے۔ اُن کے دل میں اور اُن کی اُس امیرانہ ملکہ شاہانہ دھوم دھام میں سچ پوچھیے تو ہمارے غموں سے بڑے غم اور ہماری حسرتوں سے بڑی حسرتیں موجود ہیں۔ جس طرح ایک کوہستانی سلسلہ دُور سے ہمیں نہایت مسطح پُر فضا اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور نزدیک سے جا کے دیکھو تو انتہا سے زیادہ غیر مسطح۔ بہت ہی پُر خطر اور وحشت ناک نظر آتا ہے اُسی طرح اے غریبی کی زندگی بسر کرنے والو۔ امیروں اور بادشاہوں کی سطوت و حشمت اور ان کے عالیشان قصر و ایوان تمھیں دور ہی سے عشرت و مسرت کے مامن نظر آتے ہیں مگر اُن کے قریب جا کے خود اُن کی جگہ پر کھڑے ہو کے اور ان کی

اصلی حالت کا اندازہ کر کے غور کرو تو صاف دیکھ لوگے کہ خوشی اور مسرت اُنکے اس وسیع اور بڑے خزانے میں تم سے بھی کم اور بہت ہی کم ہے۔

اصلی خوشی ایک دلچسپ خیال سے عبارت ہے جو اکثر اُس دل میں زیادہ ہوتا ہے جس میں خواہشیں کم ہیں۔ جس قدر تم اپنی ضرورتوں کا دائرہ تنگ کرتے جاؤگے اُسی قدر تمھاری مسرت بڑھتی جائے گی۔ ہم نے بڑے بڑے اور نہایت ہی عالی مرتبہ اور صاحب حکومت امیروں کو ادنیٰ طبقے کے مزدوروں اور مزدورنیوں پر حسد کرتے دیکھا ہے۔ یہ معمولی درجے کے لوگ جنھیں تم اپنے فضول اور بیہودہ غرور سے ادنیٰ و کمتر اور حقیر و ذلیل خیال کرتے ہو ان کی حالت کا جب اندازہ کروگے تو عام طور پر اُنھیں اپنے سے زیادہ خوش پاؤگے۔ سعدی کے کلام میں اُس بادشاہ بن جانے والے فقیر کا یہ جملہ کہ "آن دم غم نانے بود و اکنون غم جہانے" آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ان غریبوں کو فقط اتنی فکر ہے کہ قوت لایموت کے لیے دن بھر میں کچھ پیسے فراہم کرلیں۔ اُن کے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ہر قسم کی محنت کرنے کو آمادہ ہوجاتے ہیں۔ پھر اس محنت کے بعد جب شام کو اپنی بی بی بچوں میں آکے بیٹھتے ہیں تو اُن سے زیادہ مسرور اور خوش حال کوئی نہیں ہوتا۔ اُن کی محنت اُن میں رات کے آرام کی قدر پیدا کرتی ہے۔ اور اُس محنت کا حاصل کیا ہوا مختصر سرمایہ اُن کی فکریں دُور کر دیتا ہے۔ اور یہ دونو ایسی برکتیں ہیں جن کی بدولت شام کو اُنھیں وہ اطمینان و فارغ البالی اور وہ خوشی و خرمی حاصل ہوجاتی ہے جو اُن سے زیادہ استطاعت رکھنے والوں کو کبھی زندگی بھر نصیب نہیں ہوئی۔

ان لوگوں کی حالت دیکھ کے تمھیں بخوبی سبق مل سکتا ہے کہ اگر تم بھی اپنی فکریں محدود۔ اپنی ضرورتیں کم اور اپنی خواہشیں دل سے نکال دوگے تو تمھیں بھی اصلی خوشی حاصل ہوجائے گی۔ اس لیے کہ اگر تمھیں حقیقت میں خوشی و مسرت کی تلاش ہے تو اُسے عمارت کے محل۔ سلطنت کے دربار، اور ظاہری عیش و عشرت کی صحبتوں میں نہ ڈھونڈو بلکہ اُسے غریب کے

جھونپڑے مین جا کے تلاش کرو۔ وہ وہین ملے گی۔ اور اکثر وہین رہتی ہے۔
اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ خدا کے خزانے مین خوشی کی کمی نہین۔ وہ وہان کثرت سے موجود ہے۔ اور ہمین کثرت سے مل سکتی ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ ہم مین سے اکثر لوگ اپنی نا سمجھی اور غلط خیالی سے اُسے ٹھیک جگہ جا کے نہین ڈھونڈھتے۔ اُن کے دھوکا دینے کے لیے دنیا والون نے شہوت پرستی کی صحبت کا نام محفل عیش رکھ دیا ہے۔ اکثرون کے خیال مین یہی ہوئی ہے کہ خوشی صرف ناز و نعمت کے قصرون۔ دولتمندی و تمکنت کے محلون۔ اور حکومت و سطوت کے ایوانون مین رہتی ہے۔ اور وہین اُس کے ڈھونڈنے کو وہ جاتے بھی ہین۔ جس کی بدولت طرح طرح کی ذلتین اُٹھاتے ہین۔ مغلوب و مقہور ہوتے ہین۔ جھوٹ بولنے اور خوشامد کرنے پر مجبور ہوتے ہین۔ اور ان سب خرابیون اور تباہیون کے برداشت کرنے کے بعد غور کرتے ہین تو اپنے دل مین خوشی کا نام و نشان بھی نہین پاتے۔ اس غلط راستے کو چھوڑ کے اگر غربت کے جھونپڑون۔ اور بیفکری کے چھپرون کے نیچے دیکھین تو وہ لعل بے بہا ضرور ہاتھ آجائے گا جس کے لیے اُنھون نے دنیا کے بڑے بڑے عالیشان محل اور زبردست قلعے چھان مارے تھے۔

انسان جس وقت اور جتنی دفعہ اپنے دل مین کہتا ہے کہ "یہ چیز ملنی چاہیے" اسی وقت اور اتنی ہی دفعہ ایک فکر اور اُس کے ساتھ ہی ایک غم اپنے لیے پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ نہ کرے اور اس جملے کے خیال سے اپنے دل کو بچالے تو بہت ہی جلد غم سامنے سے بھاگ جائے گا۔ اور وہ خوشی مل جائے گی جسے تباہی و پریشانی کے ساتھ ذلتین اُٹھا اُٹھا کے ہر طرف ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔

لوگ کہتے ہین اور عام طور پر مشہور ہے کہ "پیٹ کے لیے انسان ذلیل ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے کبھی اطمینان نہین نصیب ہوتا" مگر غور سے دیکھو تو جس قدر سہل الحصول قوت لا یموت ہے کوئی چیز نہین۔ خدا نے چونکہ یہ ایک لازمی خواہش انسان مین پیدا کی ہے۔ اسی وجہ سے اُسکے

دُور ہونے اور بھوک کی ضرورتیں رفع ہونے کا جتنا سامان خدا نے پیدا کر دیا ہے اور کسی چیز کا نہیں - یہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خواہش پوری کرنے کے لیے ساری دُنیا الوان نعمت کا ایک پُر تکلف خوان بنی ہوئی ہے - اگر چاہو تو قدم قدم پر پیٹ بھر سکتے ہو - بہت تھوڑی محنت اور بالکل معمولی درجے کی زحمت اُسکے لیے بخوبی کافی ہو سکتی ہے - غریب و امیر اور بادشاہ و وزیر کے روزانہ مصارف پر نظر ڈالو تو حیرت سے دیکھو گے کہ سب سے کم خرچ اُسی چیز میں ہوا جو صرف پیٹ بھرنے اور بھوک کی آگ بجھانے کے لیے تھی -

تمھیں ذلیل کرنے والی اور زیادہ پریشان و سرگردان بنانے والی عموماً وہی خواہشیں ہیں جن کو اس فطری تقاضے یعنی بھوک سے علاقہ نہیں - بلکہ وہ وہی خواہشیں ہیں جن کو تم نے اپنی ہوس پرستیوں کے لیے خود ہی تصنیف کر لیا ہے - اُن سے پیچھا چھڑاؤ - اُن کو دل سے نکلاؤ - اور دیکھو کہ سچی مسرت اور بے غل و غش خوشی تمھارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے -

ریختی گوئی

اُردو شاعری کو جس چیز نے سب سے زیادہ ناپاک بنایا اور اُس میں گندگی و نجاست کا ایک بہت بڑا دفتر پیدا کر دیا وہ ریختی ہے - شہوت پرست امیروں کی صحبتوں میں مسخرہ پن کی صورت میں یہ بیہودگی و بیشرمی شروع ہوئی - اور آخر اسی طریقے سے اور ایسے ہی ناپاک مذاق والے رئیسوں کی محفلوں میں پرورش پا کے اس درجے کو پہونچی کہ اُس رنگ کے دیوان مرتب ہونے لگے - اور ہر صحبت میں اُس قسم کے شعروں کا چرچا ہونے لگا -

اس سے بڑھ کے بیحیائی اور بے شرمی کا شاید کوئی نمونہ نظر نہ آئے گا کہ ایک مرد جو اپنے کو شاعر کہتا ہے ڈاڑھی مونچھ لگائے سر سے دوپٹہ اوڑھتا ہے اور عورتوں کی تو سچی نقل کر نہیں سکتا (کیونکہ عورت کے جذبات مرد میں پیدا ہوں، یہ امر فطرت اور قانون قدرت کے خلاف ہے) ہاں زنانوں اور ہیجڑوں کی

طرح ناک پر اُنگلی رکھ رکھ کے اور تالیاں بجا بجا کے زنانے لہجے اور بازاری عورتوں کے نخروں کے ساتھ شعر پڑھتا ہے -

ایسے اشعار کی بنیاد ہی چونکہ بدکاری اور بیحیائی سے پڑی ہے - لہذا عموماً اس قسم کے اشعار مین فحش اور ناپاک اور ذلیل الفاظ بہت کثرت سے ہوتے ہین جنھین سُن کے ہمارے بے غیرت امیرزادے خوش ہوتے اور کھلکھلاتے ہین - کاش عورتون ہی کا مذاق دکھانا تھا تو شریف بہو بیٹیون اور پاکدامن اور باعفت خاتونون کے مذاق کا لحاظ رکھا جاتا - مگر نہین یہان تو اس سے غرض ہے کہ بیحیا اور بدکار عورتون کی ادائین اور اُن کی بداخلاقی و بداطواری کی حرکتین دکھائی جائین -

افسوس ہماری شاعری پر جو الہام ربانی کا نمونہ بتائی جاتی ہے ان ہرزہ سراؤن کے ہاتھون ایسا ظلم ہوتا ہے اور بدمذاق و بدکار امیرزادون کو اپنے نفسانی جذبات کے سامنے اس کی بھی تمیز اور حس نہین باقی رہتی کہ ایسے شرمناک کلام اور بیحیائی کے شعرون سے قوم اور ملک کو کتنا بڑا ضرر پہونچ رہا ہے - دوسرے ملکون اور دوسری قومون کے لوگ جب اس شرمناک کلام کو دیکھین گے تو اُنہین اس کی تو مطلقاً حس نہ ہوگی کہ یہ بازاری عورتون اور زنانون کی زبان اور اُنھین کی وضع ہے - بلکہ وہ یقین کرلین گے کہ یہ شریف زادیون کے حرکات اور چال چلن کا نمونہ ہے - اور پھر ایسا خیال قائم ہو جانے کے بعد اُردو بولنے والی عورتون کی عصمت و عفت غیرون کی نظر مین کس قدر ادنیٰ اور ناقص ثابت ہو جائے گی -

جس قسم کا ظلم بدبختی کی شاعری نے اُردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا ہے ایسا ظلم آج تک کبھی کسی قسم کے اشعار سے کسی زبان پر نہین ہوا تھا - سلف سے آج تک کسی زبان مین ایسی ناپاک شاعری نہین پیدا ہوئی تھی - جس سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی قوم مین ایسے بیہودہ اور ایسے بیحیا شاعر نہین پیدا ہوے تھے جیسے کہ اُردو مین پیدا ہوے ہین -

اکثر ترقی یافتہ قومون اور مشہور و معروف زبانون میں لائق عورتون نے

اپنے جذبات اور اپنے خیالات اپنی ہی زبان مین ضرور ظاہر کیے ہین مگر نہایت تہذیب و شائستگی کے ساتھ - اس مین شک نہین کہ عورتون کی زبان جو عموماً سادی اور دلکش ہوتی ہے اور اکثر اس مین ایک خاص قسم کا لوچ اور لطف ہوتا ہے شاعری اور انشا پردازی کی جان ہے - مگر اُسی تہذیب کے ساتھ جس تہذیب سے کہ کوئی پاکدامن اور عفیفہ عورت اپنے خیالات کو ظاہر کرے - یہ نہین کہ مرد عورتون کا سا دوپٹہ اوڑھ کے اور زنانی صورت بنا کے اپنی شہوت پرستی کی آرزو پوری کرین اور اپنے ناپاک دل کا حوصلہ پورا کرین -

انگریزی مین انشا پردازی کا بہت زیادہ حصہ خاتونان قوم ہی کی قلم سے زینت پا رہا ہے - جو نیز شاعری کی حیثیت سے اور نیز ناول نویسی کے انداز سے اپنے پاکیزہ خیالات - اپنی ستھری زبان - اور اپنے مہذب و شریفانہ جذبات کو پبلک کے سامنے پیش کر کے داد خواہ ہوتی ہین - اور قوم اور زبان مین تہذیب و پاکبازی کی روح پھونکتی ہین - وہان مرد بیحیائی کے یہ کرشمے نہین کرتے کہ عورت بن کے اور بھاؤ بتا بتا کے مخش بکنے لگیں -

یہی حالت عرب کی ہے - جس مین ہزارہا شاعرہ عورتین گذری ہین - اُنھون نے اپنی پاک و صاف اور مقبول زبان آور اور داد دینے والون کے کوثر مین دھوئی ہوئی زبان مین قصیدے بھی کہے ہین - جوش دلانے والے اشعار بھی تصنیف کیے ہین - مگر کبھی یہ نہیں کیا کہ ہیجڑون کی طرح نخرے کرنے اور تالیان بجانے لگی ہون - یا مردون نے اُن کا بہروپ بھر کے اُنکی نہایت ہی فحش اور شرمناک تصویر دکھائی ہو -

افسوس بہت سے لوگ ہون گے جو جان صاحب کا دیوان پڑھ کے یقین کرتے ہون گے کہ لکھنؤ کی شریف زادیون کی یہی حرکتین - یہی ادائیں اور اُن کے یہی الفاظ ہیں - حالانکہ سچ یہ ہے کہ سوا بازاری رنڈیون کے شریف عورتون مین ان الفاظ اور حرکات کا کہین نشان و گمان بھی نہین ہے -

اگر عورتوں کے کلام اور اُن کی سادی زبان کا لطف دیکھنا چاہتے ہو تو اُنھین کو موقع دو کہ اپنے مہذب اور پاک و صاف خیالات کو اپنی زبان مین ادا

کرین۔ ہمارے یہان ایک دوسرا ستم یہ ہوگیا ہے کہ جو عورتین شعر کہتی ہین وہ مرد اُستادون کی تقلید اور موجودہ شعرا کے تتبع مین اپنے آپ کو مذکر کی ضمیرون سے یاد کرتی ہین۔ صرف یہی نہین بلکہ وہ مردون ہی کے تیور اختیار کرتی ہین اور انھین کے دلی جذبات کو اپنی زبان سے ظاہر کرتی ہین۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتین تو شاعری کی دنیا مین آ کے مرد بن جاتی ہین۔ اور ریختی گو مرد شعر کہتے اور پڑھتے وقت عورت بن جاتے ہین۔ اور سچ پوچھیے تو دونون ناقص اور بیہودہ۔ کیونکہ جس طرح مرد کا عورت بننا بالکل خلاف فطرت۔ لغو۔ نازیب اور غیر موزون ہوتا ہے اسی طرح عورت کا مرد بننا بھی انتہا سے زیادہ خلاف نیچر اور نازیبا معلوم ہوتا ہے فطرت ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ مرد پر مردانگی ہی کی باتین پھبتی ہین۔ اور عورت پر نسائیت ہی کی باتین۔ مگر اُردو شاعری نے واقعی یہ عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کہ اس کی طرف توجہ کر کے عورتین مرد بن جاتی ہیں اور مرد عورتین۔

پاک سرزمین عرب مین جب کسی عورت نے شعر کہا ہے تو ہمیشہ اپنے آپ کو عورت ہی دکھایا ہے۔ مونث ہی کی ضمیر سے اپنے کو یاد کیا ہے۔ عورت ہی کے خیالات و جذبات باقی رکھے ہین۔ اور عورت ہی کے الفاظ۔ اور چونکہ وہ نیچرل ہین لهذا ان میں اثر بھی بلا کا ہے۔

عباسی خلیفۂ بغداد مقتفی باللہ کے عہد مین بغداد کی ایک صاحب جمال حسین و پاک دامن نازنین نے جسکا نام سلمی بنت قراطیس تھا یہ شعر کہے تھے:

عُیُونُ مُهَا الصَّرِیمِ فِدَآءُ عَینِی ۔۔۔ وَاَجیادُ الظِّبَاءِ فِدَاءُ جِیدِی[1]

اُزَیِّنُ بِالعُقُودِ وَاِنَّ نَحرِی ۔۔۔ لَاَزْیَنُ لِلعُقُودِ مِنَ العُقُودِ[2]

وَلَا اَشکُو مِنَ الاَوصَابِ ثِقْلاً ۔۔۔ وَتَشکُو قَامَتِی ثِقَلَ النُّهُودِ[3]

[1] جنگلی گاؤن کی کالی آنکھین میری آنکھون پر قربان + اور ہرنیوں کے گلے میرے گلے کے صدقے۔

[2] مین آرائش کے لیے موتیوں کا ہار پہن لیتی ہون مگر جتنی زینت اُن ہارون سے میرے سینے کو حاصل ہو سکے اُس سے زیادہ رونق وہ خود میرے سینے سے پاتے ہیں۔

[3] اور مین سر نیوں کی شکایت نہین کرتی کہ بھاری ہین۔ مگر ہان میرا قد سینے کے اُبھار کا البتہ شاکی ہے (اس لیے کہ چھاتیون کے بوجھ سے لچک لچک جاتا ہے)۔

یہ اشعار اس قدر دلچسپ اور پسندیدہ تھے کہ تصنیف ہوتے ہی سارے بغداد مین پھیل گئے۔ اور اکثر لوگون کی زبان پر جاری تھے۔ ہوتے ہوتے خلیفہ مذکور یعنی مقتفی باللہ کے گوش گذار ہوے۔ اُس نے سُن کے اہل دربار سے کہا "ذرا دریافت تو کرو کہ یہ عورت ایسی ہی ہے جیسا کہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے یا فقط مبالغۂ شاعرانہ ہے" لوگون نے بخوبی معلوم کر کے عرض کیا کہ "حضور یہ نازنین جتنا کہ ان شعرون سے ظاہر ہوتا ہے اُتنی ہی نہین بلکہ اس سے بھی زیادہ صاحب جمال ہے"۔ اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد اُس نے کہا "اچھا اب تحقیق کرو کہ اس کا چال چلن کیسا ہے؟" یہ بھی دریافت کر کے دربار مین عرض کیا گیا کہ "نہایت ہی پارسا و پاکدامن ہے"۔ جب یہ بھی معلوم ہو گیا تو مقتفی نے بطور انعام و اکرام کے بہت سا روپیہ اُسکو بھیجوایا اور کہلا بھیجا کہ "یہ رقم محض اس غرض سے دی گئی ہے کہ اس سے اپنی عفت و پاکدامنی کے محفوظ رکھنے مین مدد لو"۔

یہ ہے شان سچی شریفانہ شاعری کی۔ اور چونکہ ایک شریف خاتون نے ان اشعار کے ذریعہ سے اپنے دل کے سچے جذبات ظاہر کیے ہین لہذا ان مین وہ اثر اور وہ لطف ہے کہ ریختی کے پندرہ ہزار دیوان ان کے سامنے پھاڑ کے پھینک دیجیے۔ الغرض اگر اردو کو فائدہ پہونچانا ہے تو یہ کوشش کی جائے کہ مرد و عورت جو کوئی شعر کہے اپنے اصلی جذبات و خیالات کو اپنے ہی لہجے اور اپنی ہی زبان مین ادا کرے۔ تاکہ کلام مین پورا اثر ہو۔ اور اگر ایسا کرنا اُسے پسند یا گوارا نہ ہو تو شاعری کا نام نہ لے۔ اپنی حماقت پر شاعری کے قربان کرنے سے کوئی نتیجہ نہین۔

مانی

ہمارے ملک مین اور ہماری زبان بولنے والون مین کون ہو گا جس نے شعرا کے کلام کو پڑھا ہو اور مانی کا نام نہ سُنا ہو جو مصوری اور نقاشی کا سب سے

بڑا کامل نمونہ اور اتنا بڑا باکمال شخص مانا جاتا ہے کہ کوئی مصور چاہے کتنا ہی بڑا مصور ہو جائے مگر ملک کے خیال میں مانی کے درجے سے نہیں بڑھ سکتا۔ مگر افسوس کہ سارے ہندوستان میں شاید شاذ ونادر ہی کوئی جانتا ہوگا کہ مانی کون شخص تھا کس زمانے میں تھا؟ کیا کرتا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ اور کیونکر اور کہاں مرا؟

واقعی ہمارے لٹریچر کا یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ ہم اُن لوگوں کے حالات سے بہت ہی کم واقف ہیں جن کے نام بار بار ہماری زبانوں پر آتے ہیں۔ ہمارے قلموں سے نکلتے ہیں۔ اور جو ہماری انشاپردازی کا زیور بنے ہوئے ہیں۔ دلگداز نے اس بات کی کوشش شروع کی ہے کہ ایسے تمام لوگوں کے حالات سے پبلک کو واقف کردے۔ چنانچہ ہم بہت سے لوگوں کے حالات اسی رسالہ کے صفحوں پر شایع کر چکے۔ اور اب اس مشہور و معروف نقاش عجم کے سوانحمری کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

مانی ایک ایرانی نژاد اور مجوسی الاصل شخص تھا۔ اگرچہ اُس کا سن ولادت ہمیں نہیں معلوم۔ مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ اُس کا نشو ونما اور عروج تیسری صدی عیسوی میں یعنی حضرت محمد صلعم سے تقریباً تین سو برس پیشتر ہوا اپنے وطن کے اُستادوں سے سیکھ کے اور نیز اپنی ذاتی طباعی و مناسبت سے کام لے کے فن مصوری میں اس درجے کو پہونچ گیا کہ سارے مُلک میں کوئی شخص ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اُس کے کمالات صرف اسی فن پر محدود نہ تھے۔ علمی ذوق نے اسے جتنا بڑا مصور بنایا تھا اُتنا ہی بڑا فلسفی اور اُسی درجے کا ہیأت دان اور نجومی بھی بنا دیا۔ الغرض علوم فلسفیہ اور الٰہیات میں غور و تدبر کرنے کے ساتھ اُس نے دنیا کی پولٹیکل اور سوشل حالت دیکھی۔ اور کوشش کی کہ ان مذہبی جھگڑوں کو مٹا کے دنیا کو ایک اصول کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔

اُن دنوں دُنیا کی پولٹیکل حالت یہ تھی کہ ممالک مشرق میں باوجود بڑی کوششوں کے دین عیسوی کو کسی طرح کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ مغرب میں تو مسیحیت بحر اعظم مغرب کے سواحل تک جا پہونچی تھی۔ مگر مشرق کی طرف دین

دین زرتشتی نے اُسے اسیا روکا کہ کسی طرح دریاے فرات و دجلہ سے آگے بڑھنے نہ پاتی تھی - جہان کے سرحدی اضلاع وصوبجات مین پولٹیکل انقلابات کے دامن مین چھپ چھپ کے دین عیسوی اور دین زرتشتی لڑ رہے تھے - چنانچہ آرمینیہ جو ایران وروم کا سرحدی صوبہ تھا اس قسم کی عظیم الشان معرکہ آرائیون کا دنگل اور بڑی بڑی سازشون کا مرکز بن گیا - یہان کا فرمان روا ایک عیسوی واعظ کی تلقین سے عیسائی ہوگیا تھا - لیکن جب دولت عجم کے ساسانی فرمان روا کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے اُس مسیحی حاکم کو قتل کر کے پہلی آتش پرستی قائم کردی - اتفاقاً اب مسیحیت کے فروغ پانے کا یہ ایک نیا سلسلہ جاری ہوگیا کہ خاص ساسانی خاندان کا ایک شاہزادہ اور ایک شاہزادی جو خسرو دخت کہلاتی تھی کسی پادری کی صحبت مین بیٹھ بیٹھ کے عیسائی ہوگئے اور انکی کوشش سے پھر مسیحیت آرمینیہ مین فروغ پانے لگی - اگرچہ اب بھی تاجداران عجم نے عیسائیون پر بہت کچھ ظلم و جور کیا مگر اب مسیحیت کا قدم آرمینیہ مین جم گیا تھا اور اُسکو مٹانا غیر ممکن تھا -

یہ انقلابات یہ کشت وخون اور یہ خرابیان دیکھ کے مانی کو یہ خیال ہوا کہ کوئی ایسی کوشش کرنی چاہیے جس کی بدولت یہ جھگڑے مٹ جائین - اور ایران وروم دونون کسی نئے اصول کے تابع ہون - ان اصول کو اُس نے اپنے علم وفضل کے زور اور حسن تدبیر سے خود ہی قائم کرنا شروع کیا - مگر تاریخ سے بہت سی شہادتین مل سکتی ہین کہ ایسی کوششون کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ بعوض اسکے کہ مذہبی اختلاف مٹے ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا - اور جھگڑے بجاے مٹنے کے اور بڑھ جایا کیے - چنانچہ یہی نتیجہ مانی کی ان کوششون کا بھی ہوا -

اپنے جدید مذہب کو ہنوز تیار اور منضبط نہین کر چکا تھا کہ اپنی کوششون مین اثر پیدا کرنے کے لیے اُس نے ارادہ کیا کہ دولت ساسانی مین رسوخ پیدا کر کے اپنے ہاتھ مین حکمرانی کی قوت پیدا کرلے - اور دولت عجم کو بھی اپنے جدید کیش و آئین کا حامی بنائے - اور چونکہ بہت بڑا لائق و فائق شخص تھا

ہر جگہ اُس کے علم و فضل کا شہرہ تھا لہذا اس غرض میں اُسے بہت آسانی سے کامیابی ہوگئی - اور شہنشاہ ایران شاپور اول کے دربار میں پہونچ کے سارے ملک میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جانے لگا - اب یہ عزت و وقعت حاصل کرنے کے بعد مذہب کے متعلق اُس نے اپنے آزادانہ اور مصلحت آمیز خیالات ظاہر کرنا شروع کیے تھے کہ ایران کے تمام کاہنوں اور ملت زرتشتی کے مقتداؤن نے بڑے زور و شور سے مخالفت کی - ایران میں باوجودیکہ شاہنشاہی سطوت کے آگے ہر شخص کو غلاموں کی طرح سر جھکانا پڑتا تھا مگر مذہب کا زور اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اُس کے مقابلے میں بادشاہ سے بھی کوئی مدد نہ مل سکتی تھی - نتیجہ یہ ہوا کہ مانی کو سخت ناکامی ہوئی - اور ایسی ناکامی کہ دربار خسروی درکنار وطن کو بھی خیرباد کہنی پڑی -

مگر ایسی ناکامیاں اس طبیعت کے لوگون کے لیے عموماً بجاے مضرت رسان ہونے کے ہمیشہ مفید ہوا کی ہین - مانی دربار ساسانی سے نکلا تو سیدھا ارض مشرق کو روانہ ہوا - پہلے ترکستان مین گیا - وہان کی قومون اور اُنکے مذہب کو دیکھا - پھر ہندوستان اور چین کا سفر کیا - یہان کے مذاہب اور اُن کے اصول الٰہیات مین بصیرت حاصل کی - بودھ مذہب کی حقیقت دریافت کی برہمنون کے اخلاقی و مذہبی اصول دیکھے - اور ان سب امور مین پورا کمال حاصل کرکے ترکستان مین واپس آیا - اور اب یہان پہونچ کے اُس نے ایک سنسان گھاٹی مین جا کے خلوت اختیار کی - اس جگہ ایک شفاف چشمہ جاری تھا اور جابجا میوہ دار درختون کے موجود ہونے سے کھانے کے لیے بھی پورا اطمینان تھا - اس وادی مین وہ کامل ایک سال تک بیٹھا رہا - اور اسی خلوت کدے مین اُس نے اپنی کتاب ارتنگ تیار کی - اور جس طرح حضرت موسیٰ چالیس دن بعد کوہ طور سے توراۃ کی لوحین لے کے آئے تھے اُسی طرح وہ اپنی اس کتاب کو لے کے برآمد ہوا - اور آتے ہی لوگون سے کہا "مین خدا کے پاس سے آیا ہون جس نے مجھے مبعوث بہ نبوت کیا ہے - اور یہ آسمانی کتاب وہی ہے جس کتاب پر ساری دنیا کو عمل کرنا چاہیے" دیگر آسمانی کتابون

کے خلاف اس کتاب مین نہایت ہی اعلیٰ درجے کی تصویرین بنی ہوئی تھین - جو اُس زمانے کے اعتبار سے اتنی بڑی اعلیٰ چابکدستی اور ایسی صناعی کا ثبوت دیتی تھین کہ انسانی قوت سے بالاتر بتائی گئین - اور اُنھیں کو اُس نے اپنی اُس کتاب کے آسمانی ہونے کا معجزہ اور ثبوت قرار دیا -

فارسی و اُردو شاعری و انشاپردازی مین مانی محض ایک مشہور مصور ہے - غیاث اللغات کے مصنف نے خدا جانے کس بنا پر اُسے ایک رومی نژاد مصور بتایا ہے جو بالکل بے اصل ہے - اُس کے حالات مین لکھا ہے کہ اسنے اپنے کمال مصوری ہی کو اپنا معجزہ قرار دے کے دعوائے نبوت کیا - اُس کے اس کمال کی نسبت مولانا نظامی نے سکندرنامے مین چند ایسے واقعات لکھے ہین جو غالباً اُن دنون ایرانیون مین مشہور تھے - کیونکہ قدیم تاریخون مین اُن باتون کا کہین پتہ نہین - وہ لکھتے ہین کہ مانی نے نقاشان چین کے اعلیٰ کمال نقاشی کا شہرہ سُن کے چین کا سفر کیا - اُس کی روانگی کا حال چینیون کو معلوم ہوا تو اُنھون نے ایک اندھے کنوئین کی تہ مین (جو اُسکے راستے مین پڑنے والا تھا) ایک آئینہ بنا دیا جو پانی کا دھوکا دیتا تھا - مانی وہان پہونچا اور پانی اور شیشے کا امتیاز نہ کر سکا - چنانچہ پانی نکالنے کے لیے اُس نے اُس کنوئین مین ڈول ڈالا - مگر جب ڈول کی ٹھیس سے شیشہ ٹوٹ گیا تو اسے اپنی غلطی پر بڑی ندامت ہوئی - سمجھا کہ چینی مصورون نے مجھے دھوکا دینے کے لیے یہ چالاکی کی ہے - فوراً کنوئین مین اُترا - اور اُس شیشے کی جگہ اب اُسنے ایک ہرا اور سڑا ہوا کتا بنا دیا - جس مین اوپر سے کیڑے بلبلاتے ہوے نظر آتے تھے - اور اس صنعت سے اسکا یہ مطلب تھا کہ اول تو چینیون کی ساخت کارروائی کا جواب ہو جائے - اور پھر کوئی راہ چلتا اس کنوئین مین پانی کے لیے ڈول نہ ڈالے - اسکے بعد جب وہ چین مین پہونچ گیا تو نقاشانِ چین سے اس کا مقابلہ ہوا - قدردان بادشاہ یا امرا نے مقابلہ کی یہ صورت نکالی کہ کہ آمنے سامنے کی دو دیوارین مانی اور چینی نقاشون کو دی گئین کہ اُن پر اپنے اپنے فن کا کمال دکھائین - اور درمیان مین ایک دیوار اور اُٹھا دی گئی کہ جبتک

دونوں طرف کی تصویریں تیار نہ ہوجائیں کوئی اپنے حریف کی کارگری سے مطلع نہ ہو۔ چینیوں نے بڑی محنت وسرگرمی سے اپنی دیوار کو عجیب وغریب تصویروں کا مرقع بنا دیا۔ مگر مانی نے صرف اتنا کیا کہ اپنی دیوار کو خوب گھونٹ گھونٹ کے آئینہ بنا دیا۔ اور اُس پر ایک پردہ ڈال رکھا۔ جب دونوں نے کہا کہ اب ہم اپنی تصویریں بنا چکے تو ممتحن اور مقابلہ کرنے والے آکے کھڑے ہوے دیوار بیچ سے توڑی گئی۔ چینیوں کی صنعت کی تعریف کی گئی۔ اور اب مانی نے اپنی دیوار پر سے پردہ ہٹایا تو جو تصویریں چینیوں نے بنائی تھیں اُن کا عکس مقابل کی دیوار پر پڑا۔ اور معلوم ہوا کہ مانی نے بغیر دیکھے اُن کے مرقع کی نقل اس کمال کے ساتھ اُتار لی ہے کہ کسی بات میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ سبھوں نے اُس کی بے انتہا تعریف کی اور عش عش کرنے لگے۔ یہ واقعات اس قسم کے ہیں کہ ان کی ایک کہانی سے زیادہ وقعت نہیں معلوم ہوتی۔

بہرحال اس سفر اور اپنی ترکستان کی مذکورہ خلوت گزینی سے فراغت کر کے جب وہ ایران میں واپس گیا تو اپنے کو ایک صاحب کتاب پیغمبر بتا رہا تھا۔ اب ایران میں آتے ہی اُسے نمایاں کامیابی ہونے لگی۔ بہت سے لوگ اُسکے معتقد اور پیرو ہو گئے۔ علماے زردشتی سے اُس سے بڑے بڑے مناظرے ہوے۔ اس زمانے میں شاپور اول دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا ہرمز بن شاپور تخت وتاج ساسانی کا مالک تھا۔ ہرمز نے اُس کی بڑی قدر ومنزلت کی۔ علم وفضل کی قدردانی کر کے اس پر نہایت ہی مہربان ہوا۔ اور علاقۂ بابل میں آرابیون نام ایک قلعہ اُسے رہنے کو دیا۔

اس قلعہ میں بیٹھ کے مانی نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ اور اس کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کو شایع کرنے لگا کہ ہزارہا آدمی اُس پر ایمان لے آئے۔ اور مذہب مانوی روز افزوں ترقی کرنے لگا۔ مانی کا مذہب بادی النظر میں دین عیسوی کی ایک شاخ معلوم ہوتا ہے مگر اصل میں وہ دنیا کے تمام مذہبوں سے مرکب تھا۔ بظاہر مسیحیت کو مذہب حق تسلیم کر کے اُس نے تمام مشرقی مذاہب کے فلسفۂ الٰہی کو اپنا دستور العمل بنا لیا تھا۔ وہ وحدتِ وجود

کے مسئلہ کا حامی اور مدعی تھا۔ تخلیق عالم کی نسبت کچھ نئے اور عجیب خیالات ظاہر کیے تھے۔ آتش پرستون کے اصول کے مطابق اصلی بنا دو خداؤن یزدان و اہرمن پر قائم کی۔ اور انھین کے نتیجہ مین نور و ظلمت کی اصطلاحون سے بھی کچھ مذہبی اور روحانی کام لیا۔ حضرت مسیح کی نبوت کو تسلیم کیا۔ اور اُن سے پیشتر کے انبیا خاصتہً حضرت موسیٰ کی نبوت سے قطعاً انکار کر دیا جسکی وجہ یہ تھی کہ وہ یہودیت سے کسی قسم کا علاقہ نہین رکھنا چاہتا تھا۔ یہودیت مین اس قدر تنگ خیالی تھی اور وہ مذہب ایک قوم اور ایک خاص سرزمین سے اس قدر وابستہ تھا کہ وہ تمام نئے بانیان مذاہب جنھون نے حضرت مسیح کے بعد دین مین کوئی اجتہاد و تغیر کرنا چاہا سب کے سب دین موسوی کے خلاف تھے۔ مانی نے اپنے مذہب کے لیے اخلاقی اصول بالکل بودھ مذہب کے اخلاقی فلسفہ سے لیے۔ اور اسی سلسلے مین بعض باتین ہندوستان کے اس مذہب سے لین جو برہمنون کا مذہب ہے۔ الغرض مانی کے مذہب کی حقیقی شان یہ تھی کہ مجوسیت کے یزدان و اہرمن اور چین و ہند کے اخلاقی فلسفہ کو عیسویت کا جامہ پہنا دیا گیا۔ کتاب عہد عتیق (توراۃ) کو اُس نے شیطانی وسوسون کا نمونہ بتایا۔ اور چند اُن انجیلون کے ساتھ جنھین مسیحی جعلی بتاتے ہین مانی کی کتاب ارتنگ اس نئے دین کا دستور العمل قرار پائی۔ مگر باوجود اسکے کہ مانی نے مختلف مذاہب سے التقاط و انتخاب کیا تھا پھر بھی زرتشتیت غالب تھی۔ کیونکہ مانی کہتا ہے "عالم مصنوع اور دو قدیم و ازلی اصلون سے مرکب ہے۔ ایک نور اور ایک ظلمت۔ یہ دونون اصلی چیزین ازلی ہین۔ ہمیشہ تھین اور ہمیشہ رہین گی۔ ان مین ہمیشہ سے حس۔ عقل۔ اور دیکھنے سننے کی قوت تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ دونون باعتبار ذات۔ صورت فعل اور تدابیر کے ایک دوسرے کی ضد ہین۔ اور بلحاظ اپنے حیز کے ایک دوسرے کی مقابل ہین۔ بعینہ اسی طرح جیسے کہ کسی چیز کا سایہ اُسکے مقابل رہا کرتا ہے۔ اور جتنی خوبیان اور بھلائیان ہین سب نور کی طرف منسوب ہین اور جتنی برائیان اور خرابیان ہین سب ظلمت کی طرف منسوب ہین۔

تاہم مشرقی مذاہب کے ان خیالات و عقائد کے ساتھ اُس نے انجیل سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ فار قلیط جس کے ظہور کی بشارت حضرت مسیح نے دی تھی اور مسلمان جس کا مورد حضرت محمد (صلعم) کو بتاتے ہین خود اپنے آپ کو بتایا۔ اور علانیہ کہہ دیا کہ "حضرت عیسیٰ نے میرے ہی آنے کی پشین گوئی کی تھی"۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مانی نے اگرچہ اپنے مذہب مین سب سے زیادہ اصول آتش پرستی ہی کو قائم رکھا تھا مگر سب سے زیادہ ضرر اور صدمہ اسے خاص زرتشتیون ہی کے ہاتھ سے پہونچا۔ علماے مجوس اُس کے مخالف اور دشمن ہوتے جاتے تھے۔ جب تک ہرمز بن شاپور زندہ رہا اسوقت تک تو اُسے کچھ نقصان نہین پہونچا۔ اس لیے کہ وہ اُس کا دوست تھا۔ اور اُسی کی مہربانی سے قلعہ ارابیون مین بیٹھ کے اُسے اپنے مذہب کو شایع کرنے کا موقع ملا تھا۔ مگر جب ہرمز کے بعد اُسکا بیٹا بہرام شہنشاہ ایران ہوا تو اپنے آتش پرستون کے موبدون اور دستورون نے اُس قدر بھڑکایا کہ وہ مانی کا دشمن اور اُس کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ آخر حضرت مسیح کے ۲۷۷ برس بعد اور حضرت محمد صلعم سے ۲۹۳ سال پیشتر وہ اپنے قلعہ سے گرفتار کرکے بہرام کے سامنے لایا گیا۔ جس نے یہ نہایت ہی سخت سزا دی کہ زندگی ہی مین اُس کی کھال کھنچوالی اور اُس مین بھس بھروا دیا۔ مانی کی کھال کا یہ پتلا اپنی مظلومی کی تصویر دکھانے اور تعصب مذہبی کے ظلمون کے کارنامے ظاہر کرنے کے لیے ایک مدت تک شہر شاپور کے پھاٹک پر جو اُن دنون ساسانیون کا دارالسلطنت تھا رکھا رہا۔

لیکن مانی نے اپنی زندگی ہی مین اپنے مذہب کو اس قدر فروغ دیدیا تھا کہ اسکے بعد پورے استقلال کے ساتھ قائم رہا۔ اور چند ہی روز مین اُس نے اس قدر عروج حاصل کرلیا کہ کیتھولک مسیحیت یعنی پولوس کے پیروؤن کے مقابلے مین ایک مستقل اور زوردار مذہب بن گیا۔ اور رومی کلیسیا کا سب سے زبردست حریف یہی فرقہ تھا۔ مانوی لوگ اپنی توحید پر نازان تھے اپنے مخالف عیسائیون کو مشرک و بُت پرست بتاتے تھے۔ اور جو انتظامات کہ رومی کلیسیا کی ترویج کے لئے عمل مین آتے تھے وہی انتظامات

زیادہ قوت اور اثر کے ساتھ مانویون مین بھی قائم ہو گئے۔ چنانچہ بارہ بڑے عہدہ دار رسولون اور حواریون کے نام سے معین ہوے۔ ان کے ماتحت ۷۲ بشپ یعنی اسقف اعظم تھے۔ پھر اُن کے زیر حکم پریسبیٹر اور ڈیکن تھے جو سفر کرتے اور ہر طرف شہرون شہرون اور قریون قریون دین مانوی کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔

مانی کا قائم کیا ہوا دین مانوی ایک ہزار برس تک دنیا مین قائم رہا۔ اور باوجودیکہ روم کی مسیحی شاہنشاہی اور پطرس کے جانشین پاپاؤن نے اس پر بڑے بڑے اور طرح طرح کے ظلم کیے مگر کسی طرح اُنکے مٹائے نہ مٹ سکا۔ فتوحات اسلام سے بھی اس مذہب کو بڑا ضرر پہونچا تھا۔ لیکن اُنکی حکومت میں بھی ایک مدت دراز تک زندہ رہا۔ لیکن آخر مسلمانون ہی کی کوشش سے غالباً اس مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔

کتاب ملل و نحل مین علامہ شہرستانی نے مانی کے باپ کا نام فاتر بتایا ہے۔

ایک اصلاح

۲۹- اپریل کے تہذیب النسوان مین مولوی ممتاز علی صاحب نے کتاب "تیمارداری" پر ریویو کرتے ہوے اُس کی زبان پر دو ایک اعتراض کیے ہین۔ جنھین دیکھ کے لکھنؤ کے اکثر لوگون نے قہقہہ لگایا۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ غرغرہ کی جگہ "غرارہ" کا لفظ غلط ہے۔ ممکن ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے گھر مین یہ لفظ نہ بولا جاتا ہو۔ مگر دہلی و لکھنؤ مین سوا اطبا کے نسخون کے کل فصحا اور تمام خاتونون کی زبان پر "غرارہ" ہی ہے۔ جس کی صحت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہین:

شبے اگر بہ زبانم حدیث تو برود
ز بے طہارتی آن زباں بمے "غرارہ" کنم

اور استعمال کی حالت یہ ہے کہ شریف گھرانون کی خاتونون نے غرارہ کے سوا

غرغرہ اس محل پر شاید کبھی سنا ہی نہ ہوگا۔ اسیطرح یہ کہ کہ ارشاد ہوتا ہے۔ بڑے پائنچون والے گھیردار پائجامہ کو "غرارہ" کہتے ہین۔ یہ خدا جانے کس مُلک کی بولی ہے۔ بڑے پائنچون کا گھیردار پائجامہ نصیرالدین حیدر کے وقت لکھنؤ مین ایجاد ہوا۔ اور یہین سے اور مقامات مین پہونچا۔ مگر لکھنؤ مین آج تک کسی نے اس پائجامہ کو نہ "غرارہ" کہا اور نہ کسی کو کہتے سنا۔ اور نہ یہ دہلی کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ مین نے کبھی دہلی والون کو بھی ان معنون میں مین غرارہ کا لفظ استعمال کرتے نہین دیکھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مولوی صاحب آبلہ اور چھالے کے مقام پر "پھپھولے" کے لفظ کو غلط بتاتے ہین۔ حالانکہ ان معنون مین فصیح ترین لفظ "پھپھولے" ہی ہے۔ ان اعتراضات سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونون جو حضرات عورتون کی اصلاح و تعلیم کے ذمہ دار بن گئے ہین۔ وہ زبان اردو سے کہان تک ناآشنا ہین۔ اگر یہ خرابی اسی حد پر ختم ہو جاتی تو کوئی شکایت نہ تھی خرابی تو یہ ہے کہ ان کتابون کو پڑھ پڑھ کے خود ہماری عورتون کی زبان بگڑی جاتی ہے اس لیے کہ جہالت کی وجہ سے انکو یہ خیال گذرتا ہے کہ جو کتابون مین لکھا ہے وہی صحیح ہے۔

مولانا حالی نے دو چار ہندی الفاظ کمال اُستادی سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کر دیے ہین۔ اور وہ بھی خاص محل پر۔ اسی طرح ممدوح نے بعض تصرفات بھی کیے ہین جو ہمارے نزدیک قابل اعتراض نہین۔ مگر اُنکی تقلید مین بعض نوخیز شعرا ایسی بُری طرح بے موقع و محل ہندی لفظون کو استعمال کرنے لگے ہین اور اُن کے ہاتھون اُردو الفاظ پر ایسے بھونڈے تصرفات ہو جاتے ہین کہ زبان اُردو تباہ ہوئی جاتی ہے۔ ۳۰ مئی کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ مین چودھری خوشی محمد خان صاحب ناظر کی ایک نظم ہے۔ اُسکے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع ہے "جام گدائی ہاتھ مین لیکر دوارے دوارے پھرتے ہین" یہ "دوارے دوارے" اُردو کی جان پر ستم کا اتنا بڑا پہاڑ ہے کہ خدا ہی ہے جو وہ جان بر ہو سکے۔ پانچوین شعر کا دوسرا مصرع ہے

"جسکے اثر سے خستہ رگوں میں خون کے فوارے پھوٹتے ہیں"

یہ "فوّارے" کو تصرف کرکے "فوارے" بنادینا بھی زبان پر کوئی معمولی ظلم نہیں۔

پھر وہی اصلاح زبان

رسالہ تیمارداری اسوقت تک میری نظر سے نہین گذرا ہے۔ اُسکے الفاظ پر مولوی ممتاز علی صاحب کی غلط نکتہ چینیوں سے مین نے اختلاف کیا تھا جسکو مولوی صاحب اس پر محمول فرماتے ہین کہ وہ میرے دوست کی کتاب ہے۔ مگر یہ اُن کا حُسنِ ظن ہے۔ مین اُس کتاب کی غلطیون پر بھی اُسی طرح معترض ہون جس طرح اُس کے متعلق نکتہ چینیون کے خلاف ہون۔ مولوی صاحب نے "غرغرہ" کی جگہ "غرارہ" کے لفظ کو غلط بتایا تھا۔ میرے اعتراض کا ماحصل یہ تھا کہ غرغرہ و غرارہ دونون صحیح ہین لیکن اُردو مین غرارہ ہی فصیح ہے۔ لفظ غرارہ کی صحت کے ثبوت مین مین نے خواجہ حافظ کا شعر بھی نقل کردیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ہندوستان مین غرغرہ صرف اطبا کے نسخون مین نظر آتا ہے۔ مگر مولوی صاحب کو اس پر اطمینان نہین ہوا۔ فرماتے ہین کہ تیمارداری طب کی کتاب اور زبانِ اطبا کی تابع ہے۔ اور یہ نہین خیال کرتے کہ نسخون کی زبانِ اطبا فارسی ہے اور "تیمارداری" اُردو مین لکھی گئی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس "چھالا" "آبلہ" اور "پھپھولا" سب صحیح ہین مگر اردو مین "پھپھولا" فصیح ہے۔ لیکن "پھپھولا انگیز" بالکل غلط ہے۔ اور ایسی غلطی ہے جو کسی طرح قابلِ معافی نہین۔ سینکنے کی جگہ سکائی کرنا بھی بیشک غلط ہے اور یہ اعتراض مولوی صاحب کا صحیح ہے۔

قبرستانون کا مسئلہ

لکھنو مین میونسپلٹی کی عنایت سے قبرستانون کا مسئلہ روز بروز تکلیف دہ

ہوتا جاتا ہے - اور افسوس کہ مسلمان خبر نہیں ہوتے - شہر کے تمام قبرستان بند کر دیے گئے ہیں - جو قبرستان کھلے ہوئے ہیں وہ آبادی سے اتنی مسافت پر ہیں کہ جنازوں کا لیجانا نہایت ہی دشوار ہو گیا ہے - چند ہڑواڑیں جا بجا شہر میں خاص خاندانوں کے لیے کھلی ہوئی ہیں - مگر ہمارے ممبران بورڈ کو وہ بھی کھٹک رہی ہیں - چنانچہ فی الحال اُن کی فہرست تیار کی گئی ہے - اور ارادہ ہے کہ اُن سب ہڑواڑوں کو بھی مطلقاً بند کر دیا جائے - اُس پر طرّہ یہ ہے کہ وکٹوریہ گنج کے قریب جو عام قبرستان دیا گیا تھا وہ بھی جگہ نہ رہنے کے باعث بند ہونے والا ہے اور تجویز کی جا رہی ہے کہ کسی ایسی جگہ جو تال کٹورے کی کربلا سے بھی میل ڈیڑھ میل آگے ہے جگہ دی جائے - اگر یہی ارادہ ہے تو ہماری میونسپلٹی کے جنازوں کے وہاں لیجانے کے لیے آدمی بھی دینے چاہییں - افسوس اس بات کا ہے کہ ممبران میونسپلٹی منتخب ہوتے وقت ووٹ لینے کو تو ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ہر قسم کے اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں - مگر ایسی کارروائیوں کے وقت بغیر ہمیں خبر کیے کارروائی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں - جو فیصلہ چاہتے ہیں کر دیتے ہیں اور اسکا ذرا بھی اندازہ نہیں کرتے کہ اُن کی بے پروائی سے ہم کس مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے - ہم مذہب رکھتے ہیں اور اپنے مُردوں کو گوڑا نہیں سمجھتے کہ انھیں شہر سے باہر لیجا کے پھینک آیا کریں - ہم اپنے عزیزوں اور دوستوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کو جاتے ہیں - ہم اکثر اُن پر جا کے چراغ روشن کرتے اور پھول چڑھاتے ہیں - اگر میونسپلٹی کی یہی عنایت رہی تو اس سارے فاتحہ اور درود کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا - مسلمانوں کو مستعدی سے اُٹھ کے کوشش کرنا چاہیے - ورنہ پھر کچھ بنائے نہ بنے گی - ساری ہڑواڑیں بند ہو جائیں گی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب کو اپنے عزیزوں کی لاشیں ایسی جگہ لیجا کے پھینکنا پڑیں گی جہاں دفنانے کے بعد پھر کسی کا گذر ہی نہ ہو - یہ جو آئے دن پولٹکل جلسے ہوا کرتے ہیں اُن سب سے اہم یہی مسئلہ ہے - اور اگر اسوقت غفلت برتی گئی تو پھر کچھ بنائے نہ بنے گی اور سوا پچھتانے اور اپنی بدقسمتی پر رونے کے کچھ نہ کر سکیں گے -

ملحقہ افسیر یورپین ہین اور اُنکے اسسٹنٹ ایک نوعمر ہندو ڈاکٹر - ہی وہ افسیر ہین جن کے ہاتھ قبرستانون اور مسلمانون کے دفن ہونے کا فیصلہ ہے - قبرستانون کا معاملہ لازم ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ مین رکھا جائے جو مسلمانون کے خیالات مذاق اور مذہبی ضروریات کو بخوبی سمجھتا ہو - ہندو ڈاکٹر صاحب کے خیال مین یہ ہے کہ جب ہندو اپنی لاشون کو دور لے جاتے ہین تو مسلمان کیون نہ لیجائین - لیکن اسکا جواب یہ ہے کہ آپ براہِ کرم ہندوون کی دشواریان بھی دور کیجیے اور ایسا انتظام فرمایئے کہ اُنکو بھی تکلیف نہ ہو - یہ تو نہایت ہی بُرا اصول ہے کہ چونکہ ایک گروہ تکلیف مین مبتلا ہے لہذا دوسرے کو بھی خواہ مخواہ مبتلا کیا جائے - ہندو شاید اپنی خوشی سے دور لیجاتے ہون - کیونکہ اُن کے مسان مین کوئی تبدیلی نہین ہوئی ہے - پرانے زمانہ سے جہان تھا وہین اب بھی ہے - بخلاف اسکے مسلمانون پر یہ نئی مصیبت پڑی ہے جسکے وہ کبھی عادی نہ تھے - ہم امید کرتے ہین کہ ہمارے روشن خیال ہندو ڈاکٹر صاحب بجاے اسکے کہ مسلمانون کے مُردون کی مٹی خراب کرین ہندوون کے لیے آسانی اور سہولت پیدا کرین گے -

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ سرکاری جانب سے جو زمینین قبرستان کے لیے دی گئی ہین اُن مین قبرون کا سلسلہ کچھ اس ترتیب سے رکھا گیا ہے کہ ایک دفعہ دفن کر آنے کے بعد پھر پتہ نہین چلتا کہ وہ قبر کہان ہے اور کون سی ہے - مسلمان قبرستانون مین بھی ہٹرواڑکے عادی ہین - ہر شخص چاہتا ہے کہ اپنے عزیزون کے پاس دفن ہو اور اُسکے بال بچے اور عزیز و اقارب قبرستان مین بھی ایک مقام پر رہین - مگر ان قبرستانون مین یہ حالت ہو رہی ہے کہ کسی کو خبر ہی نہین رہتی کہ کون کہان دفن ہے - یہ شکایتین ایسی نہین ہین کہ ان کی جانب سے بے پروائی کی جائے -

افسوس کہ مسلمان اپنی ضرورتون سے خود ہی غافل ہین - اُن کا کام ہے کہ چندہ کرکے اپنے لیے دو تین عمدہ قطعات زمین جو شہر کے مختلف حلقون سے قریب ہون قیمت دے کے مہیا کرین اور اُن کا انتظام اپنے ہاتھ مین

رکھیں - اس میں نہ کسی بڑے سرمایہ کے ضرورت ہے اور نہ کوئی دشواری ہے۔ ان قطعوں میں مالی نوکر رکھ کے قبرستانوں کو گلزار بنا دیا جا سکتا ہے اور نہایت سہولیت کے ساتھ۔ کیونکہ ان باتوں کا صرف قبرستان ہی سے یہ آسانی نکل آسکتا بشرطیکہ تکیہ داروں کے عوض کوئی دیندار اور تعلیم یافتہ حضرت اُن نئے قبرستانوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھیں - علماے فرنگی محل یا ندوۃ العلما کو اس جانب توجہ کرنی چاہیے - ورنہ ہم پیشین گوئی کیے دیتے ہیں کہ عنقریب مولوی انوار صاحب کا باغ بھی بند ہوا جاتا ہے - گر سب سے پہلی کارروائی یہ ہونی چاہیے کہ شہر میں دو ایک جگہ عام جلسے کرکے میونسپلٹی کو تمام ہڑواڑوں کو بند کرنے اور اتنی دور قبرستان تجویز کرنے سے روکا جائے۔ ورنہ غضب ہو جائیگا۔

بد قسمت زبان اُردو

ہمارے اس مضمون پر بعض احباب کو بدگمانیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مگر ہم اُنھیں یقین دلاتے ہیں کہ نہ ہم اُنکے خلاف ہیں اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو دہلی و لکھنؤ کی قید سے آزاد ہو گئی۔ لیکن ہاں اُن لوگوں کی تنگ خیالی و غفلت کے ضرور شاکی ہیں۔ اس امر کو کسی آیندہ موقع پر ہم زیادہ وضاحت سے لکھیں گے سردست اس بات کی ضرورت ہے کہ اسی سلسلے میں جن خیالات کا ظاہر کرنا باقی رہ گیا ہے اُنھیں پورا پورا بیان کردیں۔ اور حقیقۃً ہمیں جو سب سے اہم بات بتانی ہے وہ ابھی تک نہیں بیان کی گئی۔

اُردو پر جو سب سے بڑی آفت نازل ہوئی ہے وہ مختلف مصنفوں اور انشا پردازوں کا اختلاف مذاق ہے۔ کسی مُلک و کسی زبان کا لٹریچر کبھی ایک رنگ کا پابند نہیں رہا۔ جس طرح شاعری میں نیز بلحاظ زبان اور نیز بلحاظ خیالات جدا جدا رنگ ہوا کرتے ہیں اُسی طرح نثر انشا پردازی میں بھی ہوتے ہیں۔ عربی - انگریزی - فارسی - جس زبان کے لٹریچر کی طرف توجہ کیجیے یہی شان نظر آئے گی - بلکہ غور کرنے کے بعد آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس زبان

مین لٹریچر کے جتنے زیادہ مختلف رنگ ہین اُسی قدر وہ زبان زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

اُردو نے جب ترقی کی دنیا مین قدم رکھا تو اُس مین بھی لٹریچر کے جدا جدا رنگ پیدا ہونے لگے۔ کسی مصنف مین یہ شان نظر آئی کہ وہ سادی روان اور بامحاورہ زبان کو پسند کرتا ہے۔ کسی مین یہ مذاق کہ نئی تشبیہات و استعارات اور طرح طرح کے دلچسپ استعارون کا گرویدہ ہے۔ اور کسی مین یہ دُھن پائی گئی کہ نازک مضامین اور باریک و دقیق خیالات ضرور ہونے چاہییے۔ یہ بھی چھوڑ دیجے۔ اُردو نے چونکہ فارسی کے نقش قدم پر چل کے نشو و نما پائی تھی اور اب اُس پر انگریزی لٹریچر کا اثر پڑنے لگا تھا لہذا ایک یہ اختلاف مذاق پیدا ہوا کہ بعض انشا پرداز اُسے پرانے فارسی رنگ مین رکھنا چاہتے ہین۔ اور کوشش کرتے ہین کہ فارسی کی طرح اس مین مبالغے ہون۔ مرادف الفاظ لائے جائین۔ اور ایک ہی خیال و مضمون جدا جدا الفاظ اور نئی نئی بندشون مین دکھایا جائے۔ ان لوگون کے مقابل مصنفین کے ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ نہین انگریزی طرز تحریر کی طرح اردو مین نہ مبالغہ ہو نہ مرادف الفاظ ہون۔ بلکہ ہر فقرے اور ہر بیان مین نیچر کی جھلک نظر آتی ہو۔

اُردو انشا پردازی مین ان اختلافات اور جدا جدا مذاقون کا پیدا ہونا درحقیقت زبان کی ترقی کی دلیل تھا۔ مگر نفاق اور پھوٹ چونکہ ہندوستان کی سرشت مین داخل ہے اور ہماری رگ و پے مین سرایت کیے ہوے ہے لہذا ہمارے یہان ان مبارک اختلافات مذاق سے بھی یہ نحوست نمایان ہوئی کہ ہر رنگ کا پسند کرنے والا دوسرے مذاق والے کی زبان بند کرنا چاہتا ہے اُس کی بُرائیان کرتا ہے۔ اور اُس کے عیب نکال نکال کے نہایت ہی ناپاک اور حاسدانہ طریقہ سے پبلک پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک کے خیال مین لٹریچر وہی ہے جسکو وہ پسند کرتا ہے۔ اور دوسرا جو کوئی لکھتا ہے اُس مین چاہے کتنی ہی محنت کرے اور کتنے ہی کمال دکھائے وہ مٹانے ڈبونے اور جلا دیے جانے کے قابل ہے۔

انگریزی مین ایک طرف کارلائل کو رکھو اور دوسری طرف مکالے کو۔ تو کتنا تضاد نظر آتا ہے۔ مگر دونون کے کلام سب لوگون کے نزدیک اعلیٰ درجے کے لٹریری کمالات مانے جاتے ہین۔ عربی مین ایک طرف تاریخ تیموری اور ابن شداد کی عبارتون کو رکھو اور دوسری طرف الف لیلہ کو تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ مگر اسکو سارا زمانہ مان رہا ہے کہ دونون عربی انشا پردازی کا اعلیٰ زیور ہین۔ فارسی مین ایک طرف درۂ نادرہ کو رکھو اور دوسری طرف انوار سہیلی کو تو ایک کو دوسرے سے کچھ بھی نسبت نہ ہوگی۔ مگر اہل زبان اور قدر دانان زبان نے دونون کو باکمال مانا اور دونون کی قدر کی۔

یہان اُردو کی انوکھی دنیا مین یہ حالت ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور معمولی درجے کے لکھنے والے درکنار بڑون بڑون اور مستند و قابل تعریف انشاپردازون کی یہ حالت ہے کہ ایک میر امن کی چار درویش کو بُرا بتاتا ہے اور دوسرا سرور کے فسانہ عجائب کے نام رکھتا ہے۔ کوئی مولوی نذیر احمد کے کلام کا گرویدہ ہے تو وہ اور سارے لکھنے والون کو زبان کا بگاڑنے اور غارت کرنے والا سمجھ رہا ہے۔ کوئی مولوی محمد حسین آزاد کی انشاپردازی کا معرف ہے تو اور سب مصنفون کی عبارت کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہین دیتا۔ ایک صاحب پنڈت رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے دلدادہ ہین تو وہ حالی اور آزاد سب کو اُن کے اوپر قربان کیے دیتے ہین۔ اسی مخالفت کا ایک کرشمہ یہ بھی نظر آرہا ہے کہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی باوجود اپنی متانت اور خاموشی کے رہ رہ کے چھیڑے جاتے ہین۔ وہ چاہین بولین یا نہ بولین مگر لوگ اس کوشش مین جان دیے دیتے ہین کہ کہ جس طرح بنے اُن کی شہرت و ناموری کو مٹا کے رکھ دین۔ مگر اسکے ساتھ ہم یہ بھی کہین گے کہ باوجود اس متانت و نیک نفسی کے غالب کی سوانحعمری کے مقدمہ مین ہمارے خواجہ صاحب بھی اس جذبہ سے نہ بچ سکے۔

اب اس سے بھی بڑھ کے ایک نیا اختلاف ناولون کی کثرت

اور اُن کی اشاعت میں روز افزوں ترقی ہوتے دیکھ کے پیدا ہوا ہے جس کی اصلی بنیاد یہ ہے کہ بعض حضرات میں فلسفیانہ مذاق بڑھا ہوا ہے۔ بعض اخلاقی کتابوں کے گرویدہ ہیں اور بعض محض مورخ ہیں۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی یا اُنکے مذاق کی کتابوں کی اُس قدر اشاعت نہیں ہوتی جتنی کہ ناولوں کی ہوتی ہے تو اپنے اُس غصہ کو موجہ بنانے اور مہذب پیرایہ میں ادا کرنے کے لیے یہ دعوے کرتے ہیں کہ ملک کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ناول نوجوانوں کے اخلاق کو بالکل غارت کیے دیتے ہیں۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یہی ناول اور اسی طرح کے عاشقانہ مذاق کے ناول ہیں جنھوں نے یورپ کو اتنی ترقی دلائی۔ اور گذشتہ یورپ کو موجودہ یورپ بنا دیا۔

ہندوستان میں جہاں نفاق کا مادہ بڑھا ہوا ہے وہاں یہ بھی ایک عجیب خاصیت ہے کہ جہاں کسی بڑے اور مستند و معتبر آدمی نے کوئی بات کہی سب لوگوں نے بے سوچے سمجھے مان لیا۔ اور اُسی کی تقلید میں بلا لحاظ اسکے کہ اُس مسئلے پر کچھ غور بھی کریں غل مچانا شروع کر دیا۔ چنانچہ دو ایک صاحبوں کی تقلید میں سب نے یہی کہنا شروع کر دیا۔ اور بزرگی و سادہ لوحی سے یہ سمجھ گئے کہ ناولوں کی مخالفت کرنے میں پبلک کو یہ معلوم ہوگا کہ ہم بہت ہی متین اور عالمانہ مذاق کے آدمی ہیں۔ اس غیر معمولی ہنگامے سے یہ حرکت ظاہر ہوئی کہ اکثر تعلیم یافتہ حضرات یہ سمجھنے لگے کہ ہم نے علانیہ طور پر کسی ناول کو پڑھا اور ہماری لیاقت و متانت میں بٹہ لگ گیا۔ دوسری یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ناول اُس قسم کا لٹریچر ہے جو انتہا سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ جسکے پڑھنے میں دماغ پر کسی قسم کا بار نہیں پڑتا۔ اور دماغ کی تھکن مٹانے اور فرصت کے اوقات میں دل بہلانے کے لیے اُس سے زیادہ موزوں کوئی لٹریچر نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں متضاد خیالوں کی یہ گت نمایاں ہوئی کہ جس طرح ایک انگریزی ناول نویس نے ایران کی یہ حالت دکھائی ہے کہ بڑے بڑے مقدس لوگوں کی پرائیوٹ خوابگاہوں میں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور عام مجمع میں وہ زہد و تقوےٰ کا وعظ کہہ رہے ہیں۔ اُسی طرح

یہاں کے بڑے بڑے مستند کیرکیٹر کے لوگوں کا یہ عالم ہے کہ گھر کے اندر سب سے چھپ کے عام مذاق کے ناولوں کو پڑھتے ہیں۔ اور باہر نکل کے ملنے جلنے والوں سے کہتے ہیں کہ مجھے ناول سے سخت نفرت ہے۔ اور جو ناولوں کو پڑھے وہ نہایت ہی ناپاک شخص ہے۔ اس مضمون کا باقی حصہ آیندہ نمبر میں تکمیل کو پہنچے گا۔

(۲)

ہم اپنے اس مضمون کو ختم نہیں کرنے پائے تھے کہ ایڈیٹر صاحب ہندوستانی کا ایک ریمارک دیکھ کے ہمیں پھر انھیں باتوں کی طرف توجہ کرنا پڑی جن پر بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے ناولوں کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اُس پر ہمارے لوکل ہمعصر بہت چوکنے ہوے۔ شاید اُنکو اس کی خبر نہیں کہ انگریزی انشاپردازی کے اصلی سنبھالنے والے اُس زبان کے ناول اور ڈراما ہیں۔ ان کی ابتدا وہاں مذہبی پہلو سے شروع ہوئی اور آخر میں ملک کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت بلکہ بعض مواقع پر پالٹکس پر بھی انھیں کی حکومت ہوگئی۔ انگلستان میں بائبل کے بعد جو کتاب سب سے زیادہ قابل قدر و عزت سمجھی جاتی ہے وہ شکسپیر کے تصانیف ہیں۔ شکسپیر ہی اخلاق کا اول درجے کا معلم اور زبان کا سب سے بڑا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اسکاٹ اور ڈکنس کے ناول ہیں۔ انگلستان شکسپیر اور ان دیگر مصنفوں کی قدر نہیں کرتا، بلکہ پرستش کرتا ہے۔ اور انگریزوں کی تقلید میں ہم اپنے ہندوستان کے انگریزی اسکالرز کو بھی شکسپیر کے تصانیف پر عشق عش کرتے دیکھتے ہیں۔ جو اعلیٰ درجے کے سلسلہ تعلیم میں بھی بارہا داخل کر دیے گئے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا شکسپیر کے ڈراما یا ڈکنس کے تصانیف میں جو انگلستان کا سب سے زیادہ مہذب ناولسٹ مانا جاتا ہے حسن و عشق کے جذبات نہیں ہیں؟ ان نئے اور عجیب الخلقت ہندوستانی مصلحان اخلاق کا یہ فلسفہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رومیو جولیٹ کا عشق تو اخلاق کو بنا دیا کرتا ہے مگر دنیا لدز کے ناولوں سے اخلاق بگڑ جاتا ہے۔ ڈکنس کے ڈیوڈ کاپرفیلڈ کی خوبصورت

ہیرو ئن ڈورا اور اگینس پر عشق کرنے سے تو انسان انسان کامل بن جاتا ہی مگر رینالڈز کی اگینس اور ایموجن کے حسن پر نظر ڈالی اور آدمی گنہگار ہوگیا۔

اب اس زمانے مین وہان ناول نویسی کو اس قدر ترقی ہو گئی ہے کہ جتنے سوسائٹی پیپر زمین عام اس سے کہ اعلیٰ ہون یا ادنیٰ کوئی ناولون سے خالی نہین - صدہا ہفتہ وار اور ماہوار ایسے رسالے نکل رہے ہین جن مین صرف ناول ہی ہوا کرتے ہین - مشہور و معروف پولیٹیکل اخبارون کے صفحات پر بھی بعض بعض اوقات ناول نظر آجایا کرتے ہین - یہ کیون؟ محض اس سبب سے کہ اخلاقی تعلیم دینے کا کوئی اس سے زیادہ دلچسپ طریقہ آج تک دنیا کو معلوم نہین ہوا - اور ساری قوم نے تسلیم کرلیا ہے کہ ناول ہی اخلاق کے اصلی مصلح ہو سکتے ہین - اسکا اصلی سبب یہی ہے کہ جس کو ہم بیشتر بھی بتا چکے ہین کہ انسان کے لیے ناول سے زیادہ دلچسپ کوئی چیز نہین ہے - فطرت انسانی اسکو ڈھونڈھتی ہے - اور اسی نے

ے بیشک رینالڈز کے ساتھ انگلستان کو ایک قسم کی نفرت سی ہے جس سے ہمارے یہان کے بعض انگریزی دان اپنی سطحی واقفیت سے یہ رائے قائم کر لیتے ہین کہ اسکے تصانیف سے اخلاق بگڑتا ہے - حالانکہ انگریزون کی نفرت کا اصلی سبب کچھ اور ہی ہے رینالڈز اُن لوگون مین تھا جو سلطنت کے مخالف ہین - امارت اور شاہی کو خدا کا غضب تصور کرتے ہین - اور انگلستان کی پبلک کا مذاق شاہی سطوت اور امارت و شوکت کا ایسا دلدادہ ہوگیا ہے کہ اب لوگ امپیریلزم کے اصول کو اختیار کرتے جاتے ہین اور لبرل پارٹی بالکل کمزور ہو گئی ہے - اور چونکہ یہ پولیٹیکل اختلافات اُس سرزمین مین مذہب کی شان سے نمایان ہوتے ہین اور باہمی تعصب کو ترقی ہوتی جاتی ہے - لہذا اُنھین رینالڈز ہر طرح بُرا نظر آنے لگا - اور ظاہر ہے کہ جب اُس نے امیرون پر عام طور پر لعنت ملامت کی تو عموماً امیرون کے طرفدار اُس سے نفرت بھی کرنے لگے - مگر باوجود اس کے اسکے تصانیف کو انگلستان کے بہت کم لوگ ہین جو نہ پڑھتے ہون ، اور اسی وجہ سے اُسکی کتابون کے ایڈیشن لاکھون کی تعداد مین طبع ہوا کرتے ہین -

دامن مین اخلاق کو چھپا کے یا پند و نصائح کو ناول کا لباس پنہا کے پیش کیا جائے تو نہایت ہی عمدہ اور مفید اثر پڑتا ہے - اس خیال نے وہان کے علما و فضلا درکنار مقتدایان دین مورخین اور فلسفیانہ مذاق والون تک کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اپنے خیالات اور خشک مسائل کو ناولون کے ذریعہ سے پبلک اور قوم مین پھیلائین - نتیجہ یہ ہوا کہ ناولون کو جو دلچسپی اور مقبولیت حاصل تھی وہ صدہا درجہ بڑھ گئی -

ہمارے یہ ہندوستانی مصلح فرماتے ہین کہ اُردو ناولون کو انگریزی ناولون سے کوئی نسبت نہین - یہان بہت ہی کم استعداد والے اور بہت ہی ناقابل لوگ ناول نویسی پر آمادہ ہو گئے ہین - اور ایسے ناول پبلک مین شایع کرتے ہین جو اخلاق کے بگاڑنے والے اور شہوت پرستی کے جذبات سے بھرے ہوے ہین - اور وہ ملک کے لیے نہایت ہی مضر ہین - اس کے متعلق اول تو مین یہ کہون گا کہ انگلستان کے مہذب سے مہذب ناولون مین بھی اسی قسم کے جذبات ہین - اور گو پہلے کہ چکا ہون مگر پھر کہتا ہون کہ کوئی وجہ نہین کہ گولڈ اسمتھ کے "ویکار آف ویکفیلڈ" مین اُس کی بیٹی الیویا کا بھگا لیجایا جانا تو ایک بڑا اخلاقی مسئلہ ہو اور ہمارا کوئی معاصر اُردو مین کسی زنانہ اسکول کے مدرسہ کے خراب یا بے پروا ہونے کے نتیجہ مین یہ دکھلادے کہ کوئی لڑکی کسی کے ساتھ چلی گئی تو وہ بہت بڑا اخلاقی جرم اور شہوت پرستی کا سبق خیال کیا جائے - شاید کوئی صاحب یہ کہین کہ ناولون مین عشق کے جذبات ہی نہ دکھلائے جائین - تو مین یہ کہون گا کہ جن صاحب کا یہ خیال ہو وہ یہی نہین جانتے کہ ناول کیا چیز ہے - ناول کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ دلچسپ ہو اور دلچسپی بغیر حُسن و عشق کے بہت ہی کم آ سکتی ہے - قطع نظر اس کے انسان کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ یہی عشق اور شادی ہے - زندگی کے بننے اور بگڑنے کا اصلی دارومدار اسی پر ہے - لہذا اُسی کے متعلق عمدہ سبق دینا ناول کا سب سے پہلا فرض ہے - اور یہی سبب ہے کہ آپ یورپ کے ناولون مین بہت کم ایسے پائین گے

جن مین حسن و عشق کی چاشنی نہ پائی جاتی ہو۔

اس کے بعد بھی ابھی یہ کہنے کی گنجائش باقی ہے کہ "اردو ناول زیادہ تر ایسے ہین کہ نہ اُن کی عبارت اچھی ہے نہ خیالات اچھے ہین۔ مبتذل محاورات اور رکیک خیالات کے سوا اُن مین کچھ نہین ہوتا"۔ اسکو مین مانتا ہون۔ مگر انگریزی ناولون مین جن ناولون کی آج کل کثرت ہے وہ بھی اکثر ایسے ہی ہوتے ہین۔ اور اُن مین سوا رکیک خیالات اور کورٹ شپ کی باتون کے کچھ نہین ہوتا۔ آپ کی طرح وہان بھی بعض ناتجربہ کار لوگ ہی اعتراض کرتے ہین۔ مگر اُن مین زیادہ تر وہی لوگ ہین جن کو ناولون کے مقابل مین اپنی تصانیف کے ناکام رہنے پر غصہ آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر چیز مین ترقی جبھی ہوتی ہے جب کثرت ہوتی ہے۔ جس طرح انگلستان مین ہزارہا ناول نویسون مین سے چند اعلیٰ درجے کے انشا پرداز اور نازک خیال ہین اُسی طرح ہمارے یہان بھی جب ہزارون لکھنے والے ہون گے تو دو چار ایسے اعلیٰ درجے کے جادو نگار ہون گے جن پر ہندوستانی لٹریچر کو ناز ہوگا۔ اسکی اُمید ہی نہ رکھنا چاہیے کہ کسی فن کے صرف دو چار جاننے والے پیدا ہون گے اور پھر اُن مین کمال بھی ہوگا۔ اُردو شاعری کو لیجیے۔ جس وقت سے اُردو مین شاعری کا چرچا شروع ہوا ہے اُس وقت سے اس وقت تک جتنے شعرا پیدا ہوے اور جتنے اس وقت موجود ہین اُن کا شمار سوا خدا کے کوئی نہین جانتا۔ مگر اس کثرت ہی کی برکت ہے کہ میر و سودا۔ ناسخ و آتش۔ ذوق و غالب۔ دبیر و انیس اور امیر و داغ پیدا ہوے۔ اگر شاعرون کی یہ کثرت نہ ہوتی تو یہ باکمال اساتذہ ہرگز نہ پیدا ہوتے۔ اسی طرح اگر ناول نویسی کی طرف یہی رجحان رہا۔ ملک مین اسی طرح کا عام ذوق و شوق رہا تو جب ہزارون ناول اور ڈراما کے مصنف پیدا ہولین گے تو ہندوستان بھی شیکسپیر۔ اسکاٹ۔ اور ڈکنس پیدا کرنے لگے گا۔ ہان اگر آپ اس سلسلے ہی کو روک دین گے تو ایک شخص بھی کمال کا درجہ نہ حاصل کر سکے گا۔ لہذا جو لوگ موجودہ ناولون کی مخالفت کرتے ہین وہ حقیقت مین ملکی لٹریچر

کے دشمن ہین اور ہماری انشا پردازی کو نقصان پہونچانا چاہتے ہین۔ بُرے اور بے مزہ ناولون کا فیصلہ کرنے والے ہم آپ نہین ہین۔ بلکہ اصلی فیصلہ کرنے والی پبلک ہے۔ جو خراب اور ناپسندیدہ ہون گے وہ خود ہی مٹ جائین گے۔

ہندوستانی اور کشمیری ورین کو سب سے زیادہ ہمارا یہ جملہ ناگوار گذرا کہ "ایک صاحب پنڈت رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے دلدادہ ہین تو وہ حالی اور آزاد سب کو اُنکے اوپر قربان کیے دیتے ہین" کہا جاتا ہے کہ آزاد کو تو اُنکے برابر کا تسلیم کیا گیا۔ اور یہ نہین خیال کیا جاتا کہ سرشار اور آزاد کا مقابلہ کرنا ہی آزاد کے لٹریچر کا خون کرنا ہے۔ اپنے پچھے کی ہر شخص تعریف کیا کرتا ہے۔ اور کشمیریون کو حق ہے کہ سرشار پہ ناز کرین۔ اسی خیال سے مسٹر چکبست کی تحریر کو سب نے خموشی سے ٹال دیا۔ ورنہ اُردو کے تمام مستند اساتذہ جانتے ہین کہ اُردو لٹریچر پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہین ہو سکتا کہ آزاد کے ایسے عالی مرتبہ اُستاد کا نام سرشار کے مقابلے مین لیا جائے۔

ہندوستانی کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے ناول مٹ گئے۔ اور ان کی طرف پبلک کی توجہ باقی نہین رہی۔ اور اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ وہ چار چار آنے پر بک رہے ہین۔ شاید اس سے زیادہ معقول دلیل ہمارے دوست کو کبھی اس سے پیشتر نہ سوجھی ہوگی۔ ان ناولون کا باوجود روک تھام کے بیسیون مطابع مین چھپ جاتا۔ اور سارے ہندوستان کے کتب فروشون مین پھیل جانا۔ اور جو قیمت اصل مین قائم کی گئی تھی اُس کا اختیار سے باہر ہو جانا اُن کی مقبولیت کی دلیل ہے یا مٹ جانے کی؟ مین تو سمجھتا ہون کہ ان ناولون کو جیسی عام مقبولیت حاصل ہو گئی ہے ویسی آج تک کسی اُردو کتاب کو نہین حاصل ہوئی۔ نہ گورنمنٹ سے انکی اشاعت مین کسی قسم کی مدد لی گئی ہے۔ نہ سررشتۂ تعلیم سے کوئی اعانت ملی ہے۔ نہ انکے لیے کانگرس۔ کانفرنس یا قومی و ملکی سوسائٹیون سے مدد لی گئی ہے۔

پھر بھی محض پبلک کی توجہ سے انکے بیسیون اڈیشنون کا چھپ جانا ایک ایسی کامیابی ہے جس کو کبھی زوال ہو سکتا ہی نہین - رہی یہ بات کہ یہ قصہ اتحاد کی پالیسی کے خلاف ہین - اتحاد ہندو مسلمانون مین اتفاق کرانے کی کوشش کرتا ہے -
ان ناولون کو زیادہ تعلق یورپ کے عیسائیون سے ہے - اُن سے اتفاق کرنے کا ہم نے بیڑا نہین اُٹھایا ہے - اس کام کو بہتر ہو کہ ہمارے دوست کانگرس کی پالسی مین تھوڑی بہت ترمیم کرکے پورا کرین - صرف ہماری ایک کتاب منصور موہنا ایسی ہے جو ہندوون کو ناگوار ہوئی - مگر اُسکے لکھتے وقت اس نتیجہ کی طرف ہمارا خیال نہین گیا تھا -

چیچک کا ٹیکا اور لیڈی ماٹیگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چیچک کا ٹیکا جو آج دنیا مین خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے - دراصل ایک مشرقی علاج ہے - اور غالباً مسلمانون ہی سے لیا گیا ہے -

ہم ہندوستان مین دیکھتے ہین کہ کامیابی کے اتنے تجربون کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکا لگائے جانے کے خوف سے امّین بچون کو چھپاتی پھرتی ہین - پُرانے مذاق کے باپ بھائی ننھے بچون کے لیے ٹیکا لگانے والون سے کشتیان لڑنے یا اُنھین رشوت دینے کو تیار ہو جاتے ہین - بڑے بڑے مہذب لوگون تک کا یہ حال ہے کہ دفع الوقتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہین اور بہت سے مُلکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کر کر کے ٹیکے کے رواج دینے پر مختلف اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہین - اور یہ نہین پسند کرتے کہ اس لاکھون دفعہ کے آزمائے ہوے علاج سے فائدہ اُٹھایا جائے - اُن کی اس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہین کہ یہ طریقہ علاج اُنھین کے ہان سے

سکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔ اور تعجب آتا ہے کہ اپنی ہی چیز جب غیروں کے ہاتھ سے ملے تو وہ کس قدر اجنبی اور عجیب بن جاتی ہے ؟

ٹیکے کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادی اور مہذب و دانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی مانٹگو میری ورٹلی تھا۔ وہ ۱۱۰۹ہجری (۱۶۹۰ء) میں انگلستان کے علاقہ نونگھم شائر میں پیدا ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس سبب سے اچھی صحبت میں نشو و نما ہوا۔ اُس کا باپ ڈیوک آف کنگسٹن روشن خیال امرائے انگلستان میں تھا جس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اور بیٹی کو بھی علم و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان میں بہت اچھا درجہ خود حاصل کر لیا اور بڑی نمایاں ترقی کی۔

بائیس برس کے سن کو پہونچی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے اقبالمند نوجوان ایڈورڈ ورٹلی مانٹیگو کے ساتھ شادی ہو گئی۔ جو پہلے ارل آف سینڈوچ کا فرزند تھا۔ مسٹر مانٹگو نے پارلیمنٹ میں چمکنا اور نمود حاصل کرنا شروع کیا۔ چند ہی روز میں وہ بڑا قابل اور روشن خیال ممبر ثابت ہوا مشہور شاعر ایڈیسن سے اُس سے بڑی دوستی تھی۔ اور انگلستان کے اعلیٰ درجے کے مدبران سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا۔

۱۱۲۵ہجری (۱۷۱۶ء) میں مسٹر مانٹگو قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہو کے دولت عثمانیہ کے دار السلطنت کو روانہ ہوے اور لیڈی میری مانٹگو نے بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی پیارے شوہر کے ساتھ استنبول کی راہ لی۔ جہاں دونوں میاں بیوی کو دو سال تک رہنا پڑا۔

قسطنطنیہ میں انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آ چکے ہوں گے مگر مسٹر مانٹگو نے محض اپنی بیوی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہیں نصیب ہوئی تھی۔ لیڈی میری یہاں ترکی امرا کے خاندانوں سے ملیں۔ اُنکے حالات دریافت کیے۔ اور جو کچھ واقعات معلوم ہوتے اُنھیں لکھ لکھ کے لندن میں اپنے دوستوں کو بھیجا کرتیں۔

یہ خطوط اس قدر دلچسپ تھے کہ لوگوں نے شوق اور قدر سے جمع کیے - اور ہر طرف لوگون مین اُنکے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا -

قیام قسطنطنیہ کے زمانے ہی مین لیڈی میری مانٹیگو کو پتہ لگا کہ یہان کے بعض گانوؤن مین چیچک کے روکنے کے لیے بعض مائین اپنے بچون کے ٹیکا لگایا کرتی ہین - اس نئے اور عجیب علاج کو اُنھون نے اُن گانوون مین جاکے دریافت کیا - جو عورتین اس کا طریقہ جانتی تھین اُن سے مل کے کیفیت دریافت کی - اُن لڑکون کو دیکھا جن کے ٹیکا لگایا گیا تھا - خوب اچھی طرح آزما لینے کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکا لگایا - اور دیکھا کہ وہ چیچک سے بالکل محفوظ رہا - تب اُنھون نے آزمایش کے لیے اور بہت سے لڑکون کے ٹیکا لگایا - اور پھر اُسے عام لوگون مین پھیلانے لگین - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ مین اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہوگیا - اور لوگ اس علمی علاج کی قدر کرنے لگے -

سنہ ۱۱۴۲ محمدی (۱۷۱۹ع) مین لیڈی میری اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان واپس آئین اور مقام ٹوئی کنہم مین بود و باش اختیار کی - اب یہان اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ و رسم ہو گیا تھا - اور گو کہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت مین بسر کرتی تھین مگر یہان بھی اُنھین شب و روز ٹیکے کے رواج دینے ہی کی فکر رہا کرتی تھی -

اس کے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی - اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور عالی دماغ شاعر ہونے کے جذبے مین آ کے لیڈی میری کی ہجو مین چند شعر کہہ ڈالے جن مین اُنکے اخلاق پر حملہ کیا اور چاہا کہ لیڈی میری کی مسلمہ ناموری - قابلیت - پاکیزگی خیال اور نیک نفسی کی شہرت کو خاک مین ملا دین - مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل مین خود ہی چور تھا اسلیے اُن اشعار کو گمنام طور پر شایع کیا - اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے شعر ہین تو انکار کر دیا - لیکن ایسی باتین کہین چھپائے چھپتی ہین؟ ہر جگہ شہرت ہوگئی کہ یہ شعر اصل مین پوپ ہی کے ہین مگر چونکہ بے اصل و

حقیقت ہین اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے ڈرتے ہیں - نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اسکے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آئے خود پوپ کو سخت بدنامی نصیب ہوئی - عام لوگون نے اُن کی اس حرکت کو ناپسند کیا - اور اُلٹے اُنھین کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے -

اب ۱۱۶۸ سنہ محمدی (۱۷۳۹ء) شروع ہوا - اور لیڈی میری کا سن ۴۹ سال کا تھا - طبیعت ناساز رہنے لگی - اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہین ہے - تبدیل آب و ہوا کے لیے اٹالیہ کا سفر کیا - وہان شہر وینس مین جا کے اقامت گزین ہوئین - اور صحت برقرار رکھنے کے لیے اس طرح پانون توڑ کے بیٹھین کہ ۲۲ سال وہین گذر گئے - ۱۱۶۸ سنہ محمدی مین گئی تھیں اور ۱۱۹۰ سنہ محمدی (۱۷۶۱ء) میں ۷۱ برس کی بوڑھی اور واجب التعظیم خاتون بن کے پھر انگلستان میں آئین - اس لیے کہ اُنکی صاحبزادی لیڈی بیوٹ نے تاکید سے بلایا تھا - مگر عمر پوری ہو چکی تھی - تندرستی نے جواب دیدیا - اور وطن مین آکے شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہون گی کہ ۱۱۹۱ سنہ محمدی (۱۷۶۲ء) مین دُنیا سے رخصت ہوگئین - اور ناموری و نیکوکاری کے رجسٹر مین اپنا نام لکھوا کے دوسرے عالم باقی مین جا پہونچین -

مگر دنیا مین اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگارین ہمیشہ باقی رہین گی جن مین سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے زندہ رکھنے کو کافی ہے - ایک تو چیچک کا ٹیکا جس سے اب ساری دنیا نفع اُٹھا رہی ہے ، اور ہندوستان ہی نہین دنیا کے ہر ملک کے گانون گانون مین لیڈی میری کی یادگار اپنی برکتون سے نوع انسان کو نفع پہونچا رہی ہے -

اور دوسری یادگار اُنکے وہ خطوط ہین جو اُنھون نے قسطنطنیہ سے اپنے احباب کو لکھے تھے - انگلستان کے لوگون مین اُنکے مطالعہ کا شوق اسقدر بڑھا کہ اُنکی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۱۹۲ سنہ محمدی مین وہ خطوط تین جلدون مین مرتب و مدوّن ہو کے چھپے اور شایع ہوئے - چند روز بعد لوگون کو کچھ اور خطوط ملے - اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شایع ہو گئی -

ان خطوط کی زبان ایسی دلکش اور شیرین تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے۔ خصوصاً اس لیے کہ ترکوں کے قومی خصائص معلوم ہونے کا یورپ میں جس قدر شوق تھا اُسی قدر حالات سے لاعلمی تھی۔ لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل و تحقیق سے آل عثمان کے حالات نہیں بتائے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے حالات میں جو پہلی کتاب انگلستان میں شایع ہوئی یہی تھی۔

لوگوں نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ پھیلائے کہ پہلا ایڈیشن چند ہی روز میں ختم ہو گیا۔ دوبارہ چھپی اور تھوڑے زمانے میں فروخت ہو گئی۔ غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ۱۲۳۲ھ محمدی (۱۸۰۳ء) میں یعنی لیڈی میری کی وفات کے ۴۱ برس بعد اُن کے صاحبزادے نے از سر نو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چاروں جلدوں اور اپنی ماں کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلیٰ درجے کا ایڈیشن شایع کیا۔

لیڈی میری کے صاحبزادے ایڈورڈ ورٹلی مانٹگو کی نسبت کہتے ہیں کہ دماغ بگڑا ہوا تھا۔ امارت اور گھر کی فارغ البالی پسند نہ تھی۔ جب دل میں آتی بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور کسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو اُن کی حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوتا۔ دوسرا کمال اُن میں یہ تھا کہ سچ سے نفرت تھی۔ اور غلط و بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکت الفاظ سے بیان کرتے اور ایسے لقلقے باندھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آجاتا اس میں اس قدر ملکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بٹ کے بیان کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ مگر بھاگنا قیامت تھا۔

پہلی بار بھاگے تو گھر والوں کو ملنے سے یاس ہو گئی چند روز بعد پتہ لگا کہ آپ ایک چمنی سوئی پ کے نوکر ہیں۔ انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر کمرے میں آتش خانہ بنا ہوتا ہے۔ اُس میں سے دھواں نکلنے کے لیے جو نل دیوار کے اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چمنی کہتے ہیں۔ اس چمنی میں دو چار مہینے میں اتنا کاجل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے۔

اس لیے وہاں بہت سے لوگ چمنی سوئیری یعنی چمنیوں میں سے کاجل جھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑوں میں چونکہ ہمیشہ کاجل بھرا رہتا ہے اس لیے حد سے زیادہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ اور انگلستان میں جو شخص جتنا زیادہ میلا ہو اُسی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے۔ غرض چمنی سوئیروں سے زیادہ ذلیل اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر آپ کو جوش خاکساری میں یہی پیشہ سب سے زیادہ پسند آیا۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو سمجھا بجھا کے گھر میں لے آئے۔ لیکن چند روز بعد پھر رفوچکر ہو گئے۔ اب کی خبر لگی کہ ایک مچھلی والے کے شاگرد ہیں۔ اور اُس کے ساتھ کشتی میں بیٹھے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لوگ گھیر گھار کے پھیر لائے۔ مگر تھوڑے زمانے کے بعد پھر چمپت ہو گئے۔ اب کی شاید ان کے مطبوعہ خطوط کا اثر تھا کہ قسطنطنیہ میں آ کے ترکوں کی طرح رہنے لگے۔ اُنھیں کی وضع اختیار کر لی۔ اُنھیں کے کپڑے علانیہ پہننا شروع کیے۔ اُنھیں کی سی ٹوپی اور دستار سر پر تھی۔ اور چونکہ ان کی پوری پوری معاشرت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ تثلیث سے توبہ کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہوں گے لہذا ہم اُن کے حق میں دعاے مغفرت کر کے سلسلۂ بیان کو ختم کرتے ہیں۔

ایک کارِ خیر

آنریبل رلے بہادر بابو گنگا پرشاد ورما نے منشی سجاد حسین صاحب کی معذوری کے زمانے میں اُن کی اعانت و دستگیری کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ وہ اس بات کے محرک ہیں کہ پبلک چندے سے اتنی رقم بنک میں جمع کر دی جائے جس سے منشی سجاد حسین صاحب کو پچیس تیس روپیہ ماہوار بطور وظیفہ ملا کرے منشی سجاد حسین صاحب بیشک پبلک کی اعانت کے مستحق ہیں۔ اُن کی حالت غور سے دیکھیے تو عبرت روزگار ہے۔ اُنکی زندگی کا آغاز نہایت فرفہ الحالی اور امیرانہ زندگی سے ہوا۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ اور گو کہ آبائی جائداد

کو انھوں نے ناعاقبت اندیشی سے تلف کر دیا مگر پھر بھی اس وقت تک اپنی لٹریری قابلیت سے معزز زندگی بسر کرتے رہے ۔ یورپ میں اس قسم کے لوگوں کی ایسی قدردانی ہوتی ہے کہ وہ آخر تک اپنی زندگی اچھی طرح نباہے جاتے ہیں ۔ مگر ہندوستان کی پبلک نے ابھی تک اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا ۔ بابو گنگا پرشاد نے جس کام کی تحریک کی ہے وہ در اصل نیا ہے ۔ مگر وہی اس کار خیر کے محرک ہو بھی سکتے تھے ۔ منشی سجاد حسین صاحب اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے اول سے آخر تک اُن تمام مسائل میں جو ہندو مسلمانوں میں مختلف فیہ رہے ہمیشہ مسلمانوں سے اختلاف کیا ۔ سرسید اور تمام مسلمان لیڈروں پر سب سے بڑے طعن و تشنیع کرنے والے وہی تھے ۔ کانفرنس اور تمام اسلامی تحریکوں سے ہمیشہ اختلاف رہا اور کانگرس کے اول درجے کے طرفدار تھے ۔ کچھ انھیں چیزوں پر منحصر نہیں ہے ۔ عموماً جو باتیں مسلمانوں میں مقبول ہوئیں منشی سجاد حسین صاحب نے انھیں ہدف سہام ضرور بنایا ۔ معاملات در کنار اپنی اس ضد میں وہ ذاتیات پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہ کرتے تھے ۔ نواب محسن الملک اور مولانا حالی کی ذات پر جیسے شرمناک حملے اودھ پنچ نے کیے اُن سے کبھی کوئی شریف شخص خوش نہ ہو سکا ۔ اس لحاظ سے سچ یہ ہے کہ بابو گنگا پرشاد ہی اس کار خیر کی تحریک کے لیے نہایت موزوں شخص تھے ۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُن کا ہاتھ بٹائیں اور یقین جانیں کہ جس خاص مذاق کے مسلم الثبوت اُستاد منشی سجاد حسین تھے اب اس تہذیب کے دور میں جبکہ علم بہت آگے بڑھ آیا ہے ہرگز نہ پیدا ہو سکیں گے ۔ مگر ایسی قابلیت اور نمود کے لوگوں کے لیے صرف پچیس روپیہ وظیفہ پبلک سے مانگ کے دینا در اصل اُنکی قدردانی نہیں تذلیل ہے ۔ میرے نزدیک بابو صاحب کو چاہیے کہ پبلک کو زیادہ فیاض بنائیں اور کم از کم ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ دلوائیں تاکہ منشی صاحب شریفانہ زندگی بسر کر سکیں جس کے وہ عادی رہے ہیں ۔ اگر زور سے تحریک کی گئی تو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا سرانجام ہونا چنداں مشکل نہیں ہے ۔

خوشی اور رنج کا انحصار طبیعت پر ہے

انسان کو ہمیشہ اپنی گذری ہوئی زندگی اور ابتدائے عمر کے واقعات یاد کر کے صدمہ ہوتا ہے اور وہ نہایت افسوس کے ساتھ یاد کرتا ہے کہ اب وہ دن پھر کبھی نہ نصیب ہونگے۔ ابتدائے عمر میں قدرت کی ہر شئے سے دلچسپی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس وقت خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کیونکہ فکریں بہت کم بلکہ بالکل نہیں ہوتیں۔ یا ہوتی ہیں تو فقط عارضی۔ اور ساری دنیا میں جس چیز پر نظر پڑ جاتی ہے وہ ہماری خوشی اور فرحت کا باعث بن جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ بعد کی عمر میں یہ حالت قائم نہیں رہ سکتی۔ جس قدر فکریں زیادہ ہو جائیں گی دنیا کی اور کسی چیز پر نظر ہی نہ پڑیگی۔ کیونکہ ہم اُنھیں فکروں سے ہر وقت پریشان رہیں گے۔ اب ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں اُس نظر سے نہیں دیکھتے جس طرح پہلے دیکھا کرتے تھے۔ لہذا ویسی خوشی اور فرحت بھی حاصل نہیں ہوتی جیسی پہلے حاصل ہوا کرتی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خوشی اور رنج دراصل کوئی چیز نہیں۔ دراصل ہماری طبیعت ہے جو ایک شئے کو خوشی اور دوسری کو رنج بنا دیا کرتی ہے۔

اگر ہماری طبیعت خوش ہے تو ہر چیز سے جسے ہم دیکھتے ہیں ایک قسم کی فرحت اور دلچسپی پیدا ہوگی۔ لیکن اگر ہم پریشان ہیں تو کوئی دلچسپ ترین منظر بھی ہمیں خوش نہیں کر سکتا۔

یورپ میں دو سو سال قبل تک یہ عام رواج تھا کہ مجرم قیدی جیلخانوں میں نہیں رکھے جاتے تھے بلکہ وہ زنجیروں میں باندھ کے کسی خاص مقام پر کام کرنے کے لیے بھیج دیے جاتے۔ اکثر قیدی جو ساری عمر کے لیے قید کیے جاتے اُنھیں جہازوں پر باندھ دیتے تاکہ وہ جہاز کی بلیاں چلائیں۔ وہ اُسی جگہ پر دن رات بندھے رہتے اور جب ضرورت ہوتی بلیاں چلاتے۔ دوسرے لوگ اُنھیں کھانا پانی پہونچا دیا کرتے۔ اسی طرح ایک شخص ساری عمر کے لیے

ایک فرانسیسی جہاز پر باندھ دیا گیا۔ اُسے صبح سے شام تک محنت کرنی پڑتی اور نہایت خراب قسم کا کھانا دیا جاتا۔ غرض اس دنیا میں اُسے کسی قسم کی امید نہ تھی۔ مگر حالت یہ تھی کہ وہ ہر وقت ہنسا کرتا کبھی فکر مند نظر نہ آتا اور لوگوں سے جو اُسکے پاس بیٹھتے مذاق کر کے دل بہلاتا کبھی وہ گاتا کبھی زنجیروں میں جکڑا ہوا اُٹھ ہوتا اور ناچنے لگتا۔ غرض وہ کبھی رنج و افسردگی کو اپنے پاس نہ آنے دیتا۔ بھلا یہ شخص جسکے لیے زندگی ایک عذاب تھی کیوں اس درجہ خوش تھا؟ اصل یہ ہے کہ اسنے اپنی طبیعت ہی کو ایسا بنا لیا تھا کہ کوئی فکر اُس پر اثر نہ کرتی۔

اسی طرح ایک اور اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ سنیئے۔ اہل فرانس عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ اور اس میں وہ اب ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ مگر اس کا ثبوت ذیل کے واقعہ سے زیادہ اور کسی طرح نہیں مل سکتا۔ گذشتہ عظیم الشان جنگ کے دوران میں بھی فرانس کے دارالسلطنت پیرس کی دلچسپیوں میں بہت کم فرق آنے پایا۔ وہاں کے بعض تھیٹر اتنے بڑے ہیں کہ ایک لاکھ آدمی ایک وقت میں تماشہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تھیٹر میں نیا تماشہ نہایت اہتمام سے کیا گیا تھا اور سارے تھیٹر میں ایک کرسی بھی خالی نہ تھی عین اُسوقت جبکہ تماشا ہو رہا تھا جرمنوں نے اپنی لانگ رینج گن سے گولہ باری کی اور ایک گولہ سڑک کے دوسری جانب عمارتوں پر گرا۔ تھیٹر اور اُن عمارتوں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ لوگوں میں جو تماشہ دیکھ رہے تھے کسی قدر پریشانی پیدا ہوئی اور کچھ لوگ اُٹھنے کا ارادہ کرنے لگے۔ فوراً تھیٹر کا منیجر نمودار ہوا اور اُسنے کہا کہ ہم اسوقت ایک نہایت دلچسپ سیر میں مشغول ہیں۔ باہر جا کے ہر قسم کی فکروں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر ہمارا آخری وقت آہی گیا ہے تو اپنی آخری گھڑیاں مصیبت اور تکلیف میں کیوں بسر کریں اسی دلچسپ فرحت بخش سیر میں نہ صرف کر دیں۔" اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک شخص بھی جگہ سے نہ ہلا اور تماشہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔

اصل یہ ہے کہ کسی مصیبت اور پریشانی کے دفع کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے دل سے بھلا دینے کی کوشش کریں۔ جبتک وہ خیال ہمارے دل میں قائم رہیگا کسی بات میں لطف حاصل نہ ہوگا۔ ہر وقت اُسی فکر میں مصروف رہنے کا سوا اسکے اور کوئی نتیجہ نہیں کہ خود کو پریشان کریں اور ایک دائمی رنج میں مبتلا رہیں۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوگا جب ہمیں کسی قسم کا صدمہ یا رنج نہ حاصل ہو۔

یوڈوشس اور لیونٹائن

اڈیسن

یوڈوشس اور لیونٹائن دو نہایت غریب لڑکے تھے لیکن دونوں سمجھدار اور نیک تھے۔ دونوں نے ساتھ ہی ساتھ تعلیم پائی اور آپس میں ایسی دوستی اور محبت ہوگئی کہ آخر عمر تک قائم رہی۔ یوڈوشس نے اسکول کی تعلیم ختم کرکے کسی سرکاری محکمہ میں نوکری کرلی اور اپنی اعلی قابلیت کی بدولت درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بڑا مالدار ہوگیا۔ لیکن لیونٹائن نے اپنی زندگی سیر و سیاحت اور مختلف علوم کے حاصل کرنے میں صرف کی۔ اور چند روز میں اُسے ہر فن سے واقفیت ہوگئی۔ اور سارے ملک میں اُس کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ اُس نے فقط اپنے ہی ملک میں سفر نہیں کیا بلکہ دور دراز کے ممالک میں گیا اور بڑے بڑے بادشاہوں سے ملا تھا۔

اس سیر و سیاحت اور مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے لیونٹائن اپنے زمانہ کا بڑا تجربہ کار عالم ہوگیا۔ اُس کا دوست یوڈوشس مال و دولت میں ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ جب دونوں کی عمر چالیس سال کے قریب ہوگئی تو اُنھوں نے ارادہ کیا کہ اب اپنی بقیہ زندگی دوستی دیہات کے آرام و آسائش میں بسر کردیں۔

اس خیال کے پیدا ہوتے ہی دونوں اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ شہروں کے شور و غل کو چھوڑ کے کہیں دیہات میں رہیں۔ دونوں نے اپنی شادیاں کیں اور یوڈوشس نے ایک بہت بڑا علاقہ خرید لیا۔ اور لیونٹائن نے بھی اپنے دوست کے قریب ہی ایک چھوٹی سی زمین مول لے لی۔

ان کی شادی کو ایک سال سے زیادہ زمانہ گذرا ہوگا کہ دونوں کے اولادیں ہوئیں۔ یوڈوشش کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور لیونٹائن کے یہاں لڑکی۔ مگر اسکے ساتھ ہی لیونٹائن کی بیوی نے بھی سفر آخرت کیا۔

ایک دن دونوں اسی غم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ لیونٹائن نے کہا "بغیر عورت کے لڑکی کی تعلیم و تربیت غیر ممکن ہے"۔ یہ کہہ کے وہ اپنی قسمت پر افسوس کرنے لگا۔ یوڈوشس ایک دوسرے خیال میں مصروف تھا۔ اُسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب لڑکوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم کسی بڑی جائداد کے مالک ہوں گے تو اُن کی تعلیم بہت زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ غرضکہ دونوں میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ اسی صلحت میں طے ہو گیا کہ دونوں اپنے اپنے بچوں کو بدل لیں۔ لیونٹائن لڑکے کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لے اور لڑکی یوڈوشس اور اُس کی بیوی کے پاس پرورش پائے اور بیس سال کی عمر تک یہ راز اُن بچوں پر بھی نہ ظاہر ہونے پائے۔ یوڈوشس کی بیوی نے بھی اس تجویز کو پسند کر لیا کیونکہ وہ سمجھدار عورت تھی اور اُس نے دیکھا کہ اس طریقے سے میرے بیٹے کی بہترین تعلیم ہو جائے گی اور پھر وہ میری نظروں کے سامنے بھی رہے گا۔ لہذا لیونٹائن کی لڑکی لیونلا کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور اپنے بیٹے فلوریو کو لیونٹائن کے حوالہ کر دیا۔ اور دونوں بچے ایسی توجہ اور محبت میں پرورش پانے لگے کہ یہ بالکل نہ معلوم ہوتا کہ پرورش کرنے والے اُن کے حقیقی والدین نہیں ہیں۔

دونوں بڑے ہوئے اور سن تمیز کو پہونچے۔ فلوریو نے اپنی حالت پر غور کیا تو اُسے نظر آیا کہ اپنی محنت کے سوا اور کوئی ذریعہ زندگی بسر کرنے کا نہیں ہے۔ روزانہ یہی خیال اُس کے دل میں پختہ ہوتا گیا۔ اور اس کا ایسا اچھا اثر پڑا کہ لیونٹائن اُسے جس طرف لگا دیتا وہ بڑی محنت سے اُسے حاصل کرتا۔ دراصل وہ بڑا ذہین واقع ہوا تھا اور لیونٹائن کی اعلیٰ تعلیم نے اُسے بہت جلد ترقی کرنے کا موقع دیا۔ ابھی اُس کی عمر پورے بیس سال کی نہ تھی کہ اُس نے بہت سے علوم حاصل کر لیے اور مردانگی کے کھیل تماشوں میں بھی بڑی شہرت حاصل کی۔

فلوریو اکثر یوڈوشس کے مکان پر آتا۔ اور بچپن کے اُنس نے اُس کے دل میں لیونلا کے ساتھ محبت کی شمع روشن کر دی جو اندر ہی اندر روشن ہو کے

عشق کے درجے کو پہونچ گئی - لیکن اپنے عشق کا حال وہ کسی پر ظاہر نہ کر سکا کیونکہ بظاہر اُسے نظر آیا تھا کہ اتنی دولتمند اور صاحب جائداد لڑکی سے کیونکر شادی کر سکون گا - لیونلا نہایت حسین شرمیلی لڑکی تھی - وہ بھی دل ہی دل میں فلوریو کے ساتھ محبت کرتی - لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا -

فلوریو اپنی ترقی تعلیم مین مصروف تھا - کیونکہ اُسے فقط یہی ایک ذریعہ ایسا نظر آیا جس سے دولت پیدا کر کے لیونلا سے بھی شادی کی درخواست کی جا سکتی ہے - اب اُس کی عمر بیس سال کے قریب پہونچ گئی تھی - اور وہ اپنے مکان سے دور کسی شہر مین تھا - دفعتہً لیونٹائن نے اسے اپنے پاس بلا بھیجا -

فلوریو لیونٹائن کے پاس پہونچا اور اُسی وقت لیونٹائن نے اُس سے کہا "میرے دوست یوڈوسش کو تم سے کچھ ضروری باتین کرنی ہین لہذا تم جا کے اُن سے مل آؤ" یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کے فلوریو سے ملا اور آبدیدہ ہو کے اُسے رخصت کر دیا -

فلوریو یوڈوشس کے مکان پر پہونچا - وہ اس کا منتظر ہی تھا - بڑی خاطر سے بٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد اطمینان سے اُس سے اُس کے نسب اور تعلیم و تربیت کا حال بیان کر دیا - پھر آخر مین کہا "در اصل لیونٹائن کی اس محنت اور مشقت کا شکریہ جو اُنھون نے تمھاری تعلیم مین اُٹھائی میرے امکان سے باہر ہے - لیکن اس کا کچھ معاوضہ اگر ہو سکتا ہے تو یہی کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ تمھاری شادی کر دی جائے - اس طرح یہ حال معلوم ہو جانے کے بعد تم لیونٹائن کے عزیز ہو گے اور اُنھین جو صدمہ تمھارے علٰحدہ کرنے کا ہوا ہو گا کم ہو جائے گا - اور لیونلا بھی اس کے بعد میری بیٹی اور میرے ہی ہان پلی اگرچہ وہ یہ نہین جانتی کہ مین در اصل اُس کا باپ نہین ہون لیکن اسے میرے ساتھ بڑی محبت ہے - اور اس محبت کا یہی صلہ ہے کہ اُس کی شادی تمھارے ساتھ کر دی جائے - تم میری جائداد کے مالک ہو اور اب اپنی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اُسے ترقی دے سکو گے - لیکن اگر تمھین پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ اتنی بڑی جائداد تمھارے قبضہ مین جائے گی تو حصول علم میں ہرگز اتنی محنت

نہ کرتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ جائداد ضائع ہوتی اور تم اُس سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھا سکتے۔ جاؤ دوسرے کمرے میں تمھاری ماں تمھارا انتظار کر رہی ہیں اور تم سے ملنے کی مجھ سے زیادہ مشتاق ہیں اور جس وقت میں نے یہ واقعات تم سے بیان کیے ہیں اُسی وقت اُنھوں نے یہ باتیں لیونلا سے کہہ دی ہوں گی"۔

فلوریو کو یہ واقعات معلوم کرکے ایسی خوشی ہوئی کہ اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُٹھ کے اُن کے قدموں پر گر پڑا۔ کیونکہ سب سے زیادہ جس بات کی اُسے خوشی ہوئی وہ اُس کی جائداد کی نہ تھی بلکہ وہ لیونلا کی تھی۔ لیونٹائن نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور اُس کے دو ہی چار روز بعد فلوریو اور لیونلا کی شادی ہو گئی۔ اور اُن کی بقیہ عمر اطمینان اور آرام میں بسر ہوئی۔

چند مختصر خیالات

بعض ندوہ والوں نے مولانا شبلی پر بدعقیدگی کا الزام عائد کیا ہے۔ ہمیں بھی مولانا سے بعض عقائد میں اختلاف ہے۔ لیکن اسکے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ

یہی کافر ہے مسلمان سچا

سچ یہ ہے کہ یہی باتیں مولانا کے کمالات کا جوہر ہیں۔ قطع نظر تبحر وسیع النظری اور علم و فضل کے مولانا کا سا ایثار نفس اور اُنکی سی بے طمعی موجودہ علماے امت میں معدوم ہے۔ سچ یہ ہے کہ ندوہ اُسی وقت تک ہے جب تک اُس میں مولانا شبلی ہیں۔ اور جس دن شبلی نہ ہوں گے اُس روز ندوہ بھی نہ ہوگا۔

ندوہ عبارت ہے مجمع علما سے۔ اور علما میں تن پروری اور خود غرضی کا مرض اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس محترم گروہ کا اصلی شعار یہ ہو گیا ہے کہ

"اپنی دنیا بنائیں اور دوسروں کی عقبیٰ" ندوہ اگرچہ عقبیٰ درست کرنے کے لیے ہے مگر ہے ایک دنیوی چیز - لہذا ایسے لوگوں سے وہ کیونکر چل سکتا ہے جو اپنے سوا دوسروں کی دنیا بنانا جانتے ہی نہیں - لوگو طبقہ علماء ہی میں سے جب ایک ایسا شخص مل گیا ہے جو اپنے ایثار نفس سے اوروں کی دنیا بھی سدھار سکتا ہے تو خدا کے لیے اُسے رہنے دو - ورنہ یہ سارا کیا دھرا خاک میں مل جائے گا اور ندوہ مولویوں اور پیرزادوں کی ایک جاگیر بن جائے گا جسکے نمونے ہر جگہ کثرت سے نظر آرہے ہیں -

---

ش - ن - کی گمنام تحریر پر بڑے بڑے لوگوں نے توجہ کی - مولانا شبلی کو اپنی براءت الگ کرنی پڑی - اور مولوی مزمل اللہ خان صاحب شہادت دینے کو کھڑے ہوگئے - جس کے معنی یہ ہوے کہ سید صاحب جو کچھ کہا کرتے تھے سچ مچ تقیتہً کہا کرتے تھے اور خود مُقر تھے کہ اُن کے عقائد اور اُن کے الفاظ میں اختلاف ہے - میں تو سمجھا ہوں کہ سید صاحب آدمی باذاق تھے یہ بزرگ اُن کے سر ہو گئے ہوں گے - اُنھوں نے سمجھایا ہوگا اور یہ سمجھے نہ ہونگے تب اُنھوں نے ان کو بنانا شروع کردیا - اور یہ بن گئے - جس کا نمونہ یہی تحریر ہے جسے یہ آج پیش فرما رہے ہیں - ان بزرگ سے کوئی پوچھے کہ جن چیزوں کا اقرارنامہ آپ کو سید صاحب نے لکھ دیا اُن سے اُن کو یا کسی کو انکار ہی کب تھا؟ یا اب کیسے انکار ہے؟ جو کچھ گفتگو ہے اُن کے مفہوم و مصداق میں ہے ورنہ ظاہری الفاظ کے تسلیم کرنے میں کسی کو نہ پہلے عذر تھا اور نہ اب ہے -

---

جو حضرات "تنباکو" کو "تمباکو" لکھنے پر زور دیتے ہیں اُن کے متعلق میر اکبر حسین صاحب نے اپنے ایک پرائیویٹ خط میں یہ بڑے پر لطف ریمارک فرمائے ہیں کہ "یہ طوفان بدتمیزی ہمارے آپ کے روکے رُکنے کا نہیں تمباکو کا تو کچھ جواب ہو بھی سکتا ہے قسمسم (قسمسم) انہتانت (انحطاط) کا کیا جواب ہے؟ میں آپ کو خط دکھاؤں گا جس میں یہ املا ہے "پوچھنا" بمبئی پر سیدن -

"سیکڑون" کی جگہ "سینکڑون"۔ جو لوگ تبا کو لکھتے ہین وہ حضرات شنبہ کو شمبہ لکھنے پر کیون نہین آمادہ ہوتے؟ ہان پچیس تیس سال مین ہی ہیل ونہار مین تو بدرُدین (بدرالدین) اور بدی الدین (بدیع الدین) دیکھ لیجیے گا۔

ہندوون اور مسلمانون کے تعلقات کا نازک ہونا خوب گُل کھلا رہا ہے۔ اُدھر ہندوون نے مردم شماری مین گنواری اور دیہاتی زبان کو ہندی قرار دے کے کوشش شروع کی کہ ہندی بولنے والون کی کثرت ثابت کرین اور اُردو زبان کو (جس کی نسبت اُنھین عجیب وہم ہوگیا ہے کہ مسلمانون کی زبان ہے گو اُسے وہ خود بھی بولتے ہین) زک دین۔ ادھر آل انڈیا مسلم لیگ نے گورنمنٹ کو اس جانب توجہ دلائی کہ ادنیٰ اور شودر قومون کو ہندوون کے زمرے مین شامل نہ کیا جائے کیونکہ یہ لوگ آرین نہین ہین۔ اور اُنکے دیوتا بھی دوسرے ہین۔ ہندو اُنھین اپنا شریک کر کے اپنی کثرت ثابت کرنے کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہین۔ چاہے ہمارے لوکل ہمعصر اڈوکیٹ خفا ہو جائین مگر بات معقول ہے۔

اس قسم کے اختلافات سے خیر اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مگر معاملات کی تحقیق تو خوب ہو جاتی ہے۔ واقعی شودر قومون کو ہندوون کے زمرے مین درج کرنا ہندوون کی توہین ہے۔ کیونکہ وہ صرف مسلمانون کے مقابلہ مین اپنے آپ کو ہندو (یعنی ہندی) کہنے لگے۔ دراصل نہ اُنھین کبھی ہندوون نے ہندو مانا تھا اور نہ وہ خود اپنے آپ کو ہندو خیال کرتے تھے۔ اگر اتنی ہی بنیاد پر وہ ہندو مانے جاتے ہین کہ اُن پر ہندوون کا اثر پڑا ہوا ہے تو پھر سکھون۔ نانک شاہیون۔ کبیر پنتھیون اور اسی طرح کے صدہا گروہون کو مسلمان لکھا جانا چاہیے جو مسلمانون کے اثر سے ہندوستان مین پیدا ہوے ہین۔

اگر گورنمنٹ نے لیگ کے کہنے پر ابھی عمل نہین کیا ہے تو آیندہ کریگی۔ اُسے اپنی کوشش سے دست بردار نہ ہونا چاہیے۔ جب یہ سچ ہے کہ ادنیٰ قوم والے

آریہ نہیں ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ ہندوؤن کے پولیٹکل مصالح کے لحاظ سے اُن کو خواہ مخواہ ہندو بنا دے۔ ایسے غریبوں تھوڑی حیثیت رکھنے والوں اور ہر سرزدربار سے نکالے ہوؤں کے لیے صرف اسلام اپنا آغوش شوق کھولے ہوے ہے۔ اور ایک کلمۂ توحید کے اظہار کے ساتھ ہی آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہے۔

مگر افسوس کہ ہندوستان کے خود پرست مسلمانوں نے ہندوؤں سے مانگی ہوئی شرافت پر نازان ہو کے اپنے آپ کو ہندو بنا لیا۔ اب بھی وہ آریہ ورت والوں کی طرح کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ خیر شرافت تو مل گئی۔ گو وہ کرایہ کی ہو۔ اگرچہ نور اسلام رخصت ہو گیا۔

مسلمانوں کو اُنکے اس مرض کی جانب ہم نے اگست کے دلگداز میں توجہ دلائی تھی۔ جسے پڑھ کے اور کسی کے کان پر تو جون بھی نہ رینگی۔ مگر اڈیٹر صاحب اخبار نور (قادیان) بڑے زور و شور سے ہماری تائید پر آمادہ ہو گئے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے اس مشرکانہ تنجتر کے وہ ایسے عبرتناک نمونے دکھائے جنھیں پڑھ کے شرم آتی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب اس کی طرف عملی توجہ کیجائے۔

ہمارے دوست کورٹ انسپکٹر صاحب کے بُلڈاگ

ہمارے دوست منشی محمد عبدالعزیز صاحب سابق کورٹ انسپکٹر لکھنؤ اگرچہ بفضلہ تعالیٰ زندہ و سلامت ہیں۔ مگر وہ نہیں رہے جو تھے۔ صورت وہی ہے۔ آواز وہی ہے۔ باتیں وہی ہیں۔ مگر مزاج اور خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ پُرانے دوست عبدالعزیز ہی نہیں باقی رہے۔ مگر اُنکے دوستی کے کتون نے کچھ ایسی عمر ابد اور لازوال ہستی پائی ہے کہ اُن کی وضع

نہین بدلتی نہ اُن کی صورت و حالت مین کوئی فرق آنے پایا ہے اور نہ اُنکا
انداز و عمر مین کوئی تغیر نمودار ہوا - لندن کے تصویر دار رسالہ "اسکیچ" مین مدتون
تک ایک دلچسپ سلسلہ "ایز مین اینڈ ڈاگ" یعنی جیسے میان ویسا کتا
مدتون جاری رہا - جس مین عجیب عجیب عنوانون سے دکھایا جاتا کہ کتا ویسا
ہی ہے جیسے اُس کے میان ہین - بخلاف اسکے یہان کتّے کو میان سے
کوئی نسبت نہین ہے -

ہمارے دوست منشی عبد العزیز صاحب بڑے قابل - ذہین - طبّاع
زندہ دل - یار باش اور نہایت ہی خوش مذاق واقع ہوئے ہین تیس سال
کا زمانہ ہوا کہ ایک خاص موقع پر کانپور مین اُن سے ملاقات ہو گئی - اور انھین
باوجود پولیس کی ملازمت کے ادبی مذاق اور انشا پردازی کے مشغلے مین
مصروف دیکھ کے ہم نہایت ہی محظوظ ہوے - ہم مذاقی عجیب چیز ہے ا
دنیا مین سب سے بڑی نعمت الٰہی یہی ہے - پہلی صحبت مین اُن سے اس قدر
اُنس ہو گیا کہ ایک گھڑی بھر کا ملنا مدتون کے لیے پر لطف یادداشتون کا ایک
بڑا بھاری ذخیرہ دماغ مین جمع کر دیا کرتا - مگر افسوس یون ہل کے جو چھوٹے تو
مدتون صورت نہ دکھائی دی - اور وہی ہوا جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؏

او بسحر رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

اس عہد فراق مین ہم تو عالم خیال مین بارہا اُن سے ملے - مگر نہین معلوم اُن
ملاقاتون کی انھین بھی خبر ہوئی یا نہین - ایک مدت کے بعد اُن کے ادبی مذاق
کا یہ نمونہ نظر آیا کہ "اخلاق عزیزی" نام ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کی اخلاقی کتاب
کہین سے ہاتھ آ گئی جس کی لوح پر لکھا تھا - "یہ قدیم الایام کے حکیم سنیکا کی کتاب
ہے جسکا ترجمہ منشی عبد العزیز صاحب نے کیا ہے" - دیکھتے ہی

"پسلی پھڑک اُٹھی نگہ انتظار کی"

اور شوق ملاقات نے جوش مارا - مگر ملنا آسان نہ تھا - دل کو یہ کہہ کے تسلّی
دے لی کہ "نہین ملتے نہ سہی، یہ کیا کم ہے کہ اپنے قدیم علمی مشغلے کو نہین بھولے
خیر - جہان رہین خوش رہین"

اس کو بھی ایک مدت گذر گئی - چند روز بعد سُنا کہ ہمارے دوست لکھنؤ کے کورٹ انسپکٹر ہو گئے - لیکن اب یہ بے دست و پائی تھی کہ وہ تو لکھنؤ مین آئے اور ہم حیدرآباد مین تھے - آخر تھوڑے دنوں ترسا کے زمانہ ہمین بھی لکھنؤ مین لے آیا - مگر یہان آنے کے بعد بھی ہم ایک زمانے تک کچھ ایسے افکار مین پھنسے رہے کہ ملنے کی نوبت نہ آئی - مگر کب تک؟ پُرانی کشش نے زور باندھنا شروع کیا - اور آخر اُن کے دروازے تک کھینچ ہی لے گئی - پولیس کی ملازمت نشیب و فراز زمانہ کے تجربون - اور عہدے کی ترقیون نے اب اُنھین وہ پُرانا عبدالعزیز تو باقی نہین رکھا تھا - لیکن ہان دوچار اگلی ادائین باقی تھین جنھون نے یقین دلایا کہ چاہے وہ پُرانا عبدالعزیز نہ ملے مگر یہ نیا عبدالعزیز بھی مزے کا ہے - اگلی سادگی کے اوپر متانت و معاملہ فہمی کا غلاف بیشک چڑھ گیا ہے مگر بے تکلفی زندہ دلی اور یار باشی بتا رہی ہے کہ اگر یہ وہ پُرانا دوست نہین تو اُسے یاد ضرور دلاتا ہے - اس زندہ دلی کے اندر خلوص کے رنگ کی بھی ہلکی سی جھلک دکھائی دی - اور پھولے ع "بندہٗ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد" پھر ہمین محبت کا بندہ بنا دیا - غرض اگلا اُنس تازہ ہو کے ترقی کرنے لگا - اور یہ حالت ہو گئی کہ دنیا کے جھگڑون سے چھٹی ہوئی اور اپنے دوست کے پاس بیٹھے ہین -

ہمارے دوست پولیس کے ایک ذی اقتدار اور صاحب اثر عہدہ دار تھے - اور ہر وقت اُن کے گرد افسران پولیس کا مجمع رہا کرتا جو چیز ہمین کبھی کبھی گران گذرتی - مگر اُن کانٹون کی طرح برداشت کر لیا کرتے جو گلچینی کے وقت اکثر ہاتھون مین چبھ جایا کرتے ہین - ہمین ادبی مذاق اور جام شاعری کے نشے نے دنیاوی ہنگامون سے غافل و بے پروا کر دیا ہے - چنانچہ لوگ تو ہمارے دوست کی صحبت مین جب دیکھیے مقدمون اور فوجداری عدالتون کے جھگڑون مین مبتلا رہتے مگر ہمارے خیال کو اُنکے کمرے کی صرف اُن چیزون سے واسطہ رہتا جو ہمین آسانی کے ساتھ واقعیت کے پُرخطر میدان سے نکال کے خیال آرائی کے پُرلطف باغ میں پہونچا دیتین -

غرض ہماری اور ہمارے دوست کی صحبت کا یہ رنگ تھا کہ کمرے مین

تختوں کا چوکا بچھا ہے - ایک جانب میز اور چند کرسیاں ہیں - لوگ کچھ کرسیوں پر ہیں کچھ تخت پر - اور کسی مقدمے کا تذکرہ چھڑا ہوا ہے - دیواروں پر ہمارے کوٹ صاحب کے اگلے مذاق مصوری کی یادگار چند تصویریں ہیں - تختوں کے پاس صدر میں ایک دیوان خانہ بنا ہوا ہے - جیسلے اوپر والے کانس کے اوپر کی الماری - اور الماری کی اوپر والی محراب - تینوں دلچسپ کھلونوں اور مٹی کی مورتوں کے مرکز بنی ہوئی ہیں - سب کے اوپر ایک پرانی دولت مغلیہ کے سچے حسن و عشق کی تصویر ہے جس میں جہانگیر و نور جہاں کی عاشقانہ زندگی کا ایک ولولہ خیز کرشمہ اور بیتاب کر دینے والا منظر دکھایا گیا ہے - اسکے نیچے محراب کے اندر چند مٹی کی مورتیں ہیں جن میں لکھنؤ کے صاحب کمال کمہار نے اپنے ہاتھوں سے مصور کے موقلم اور شاعر کی خیال آفرینی کے کمال یکجا کر دیئے ہیں - ایک رنڈی حسن فروشی کے شرمناک غرور پر کھڑی اترا رہی ہے - ایک دیسی بنیے کی جوان بن ٹھن کے گھر میں کھڑی ہوئی ہے کہ بےحس میاں پر اپنی موہنی صورت کا جادو ڈالے - ایک مارواڑی دکاندار کی پری جمال بہو گھونگھٹ نکالے - ایک ہاتھ میں لہنگا سنبھالے اور دوسرے ہاتھ کو ایسی کافر ماجرائی کی ادا سے ایک نازک و دلکش خم کے ساتھ آگے بڑھائے میکے سے سسرال جا رہی ہے کہ قلم اُس کی اداؤں کے ادا کرنے سے عاجز ہے - ایک ہندو جٹا دھاری بے نیازی کے لباس میں ہوس پرستی کے کرشمے دکھا رہا ہے - اور ان سب کے بیچ میں ایک نواب صاحب سر پر ٹیڑھی ٹوپی جمائے کھڑے ہیں گویا نظر بازی کا لپکا انھیں حسینوں کے مجمع میں کھینچ لایا ہے -

اس محراب کے نیچے آتش خانے کی کانس پر ایک سلونی اور چنچل مسلمان دھوبن کندھے پر کپڑوں کی گٹھری ڈالے - بانکے گھر سے کھڑی اپنے شوخ دیدوں سے بتا رہی ہے کہ جوانی اور حسن کی دولت خدا کسی رذیل کو نہ دے - اُسکے برابر ہی ایک بدقطع دھوبی فقط دھوتی باندھے اور کپڑوں کی گٹھری لیے کھڑا ہے - اور بتا رہا ہے کہ ان بی صاحبہ کی اصلی حقیقت یہ ہے - یوں چاہے اُن کا دماغ عرش پر پہونچ جائے -

مگر سب سے زیادہ نمایاں اور خوب متأثر دو بُلڈاگ کتے ہیں جو کالس کے دونوں سروں پر مُنہ کھولے نیم خیز بیٹھے ہیں کہ اگلے دونوں پاؤں کھڑے ہیں۔ گویا بڑی مستعدی سے اس عالم تمثال اور اس گلی صنم خانے کے دروازے پر بیٹھے پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ کتے تمام تصویروں سے بڑے اور سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اور اپنے پہرے کی جگہ پر اس مستعدی سے ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آنے والے کی نظر سب سے پہلے انھیں پر پڑتی ہے اور دیکھنے والے کے صفحۂ دل پر نقش ہو جاتی ہے

ہم جب حاضرین کی بے مزہ گفتگو سے عاجز آتے اسی صنمستان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اور وہاں اُنھیں کتوں پر نظر پڑتی۔ اس عالم میں آنے جانے والوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اِن بُلڈاگوں کا سامنا نہ ہو۔ یونہیں دیکھتے دیکھتے یہ کتے اس قدر خیال میں جم گئے کہ پیچھا چھڑائے نہ چھوٹتا۔ اور کہیں ہوں اور کسی صحبت میں ہوں اپنے دوست انسپکٹر صاحب کے مکان کا خیال آیا اور خود اُن سے پہلے یہ ظالم کتے نظر کے سامنے آکے موجود ہو گئے۔

زمانے نے اپنی عادت کے مطابق پلٹا کھانا شروع کیا۔ کورٹ انسپکٹر صاحب کے نہایت ہی عزیز اور نیک نفس و فرشتہ سیرت بھائی نے نہایت ہی حسرتناک طریقے سے سفر آخرت کیا۔ اور کئی اور بھی جیتی جاگتی صورتیں خاک میں مل گئیں۔ خود ہمارے دوست عبد العزیز صاحب اپنے ایک مہربان ڈاکٹر کی عنایت سے اِٹروپیا کا جام زہر پی کے ایسے پڑے کہ جینے کی کوئی اُمید نہ تھی مگر مسیحا نفس ڈاکٹر کی معجز نمائی نے اُنھیں بستر مرگ پر سے اُٹھا کے کھڑا کر دیا۔ اور ساری دنیا حیرت زدہ تھی کہ مُردہ کیسے جی اُٹھا؟ خیر خدا خدا کر کے خطرہ دور ہوا اور غسل صحت بھی ہو گیا۔ مگر چوٹ ایسی نہ تھی کہ دور ہونے پر بھی اُس کا کچھ نہ کچھ اثر نہ باقی رہتا۔ نظر میں ایک اضطراب پیدا ہوا اور دماغ اوہام باطلہ کا مرکز بن گیا۔

پہلے تو ہم نے مدت دراز کی جدائی کے بعد اُن میں تغیر پایا تھا اب کی آنکھوں سے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ صورت وہی ہے شکل

وہی ہے۔ ہنسی وہی ہے۔ مذاق سخن اور بذلہ سنجی کا ذوق وہی ہے۔ مگر اس سانحہ عظیم کے بعد والے عبدالعزیز اگلے عبدالعزیز کی طرح جفاکش۔ مستعد اور پتھر کے بنے ہوئے نہیں بلکہ شیشے کے بنے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ گھر سے باہر نکلے یا دہلیز کے باہر قدم رکھا اور ٹوٹ گئے۔ مجال نہیں کہ اپنے مسکن کو چھوڑیں اور کسی چیز کی ٹھیس نہ لگ جائے۔

بعض با مذاق طبیبوں نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ یہ خرابی تجرد کی وجہ سے ہے شادی ہوتے ہی سب شکایتیں رفع ہو جائیں گی۔ چند لوگوں نے منہ بھی کیا مگر بعض احباب اس طرح سر ہوئے کہ جھٹ پٹ دلھن بیاہ ہی لائے۔ اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کا تماشا نظر آ گیا۔ مگر اب بھی ہمارے دوست کا جسم شیشے ہی کا تھا۔ اتنا بھی تو نہ ہوا کہ گرم پانی کا تازہ دی ہوئی چمنی کی طرح شیشے کے اس نازک جسم میں تھوڑی بہت قائم النار ہی پیدا ہو جاتی۔ بہرحال اب ہمارے دوست بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ اور جس دماغ نے دنیا میں بڑے بڑے کام کیے تھے۔ جو نازک سے نازک پیچیدگیوں کو گھڑی بھر میں صاف کر دیا کرتا اور جو بڑی بڑی گتھیوں کو سلجھا دیتا تھا آج مصداق ع

"دماغ نازکے دارم زخود بسیار می رنجم"

سوا اپنے شیشہ جسم کی حفاظت کے اور کسی کام کا نہیں۔ لاکھ چاہا کہ دماغ سے اگلا کام لیں مگر اُس نے قطعاً جواب دیدیا۔ اور سوا اس کے کہ وظیفے کی درخواست دے کے خدمت سے علیحدہ ہو جائیں کوئی مفر نظر نہ آیا۔

اب ریٹائر ہو جانے کے بعد وہ صحبت ہی درہم برہم ہو گئی۔ جو لوگ روز روز دو وقتہ حاضری دیا کرتے تھے اُن کی صورتیں برسوں بلکہ زندگی بھر کے لیے نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ کمرے میں ہر وقت جو جمگھٹا لگا رہتا تھا خواب و خیال ہو گیا۔ اور اگر بھولے سے کوئی آ نکلتا ہے تو یہاں کا سناٹا دیکھ کے بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ "حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد"

یہ سب ہو گیا۔ مگر وہ پلنگ اگ گئے اُسی ٹھاٹ، اُسی وضع۔ اور اُسی شان سے اُس عالم گلی کے پھاٹک پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس چمنستان کی وہ

نگہبانی کر رہے ہیں اُس میں بھی بہت کچھ انقلاب ہو گیا ہے۔ بازاری کسبی اور ہندو بنیے کی جورو دونوں کا حُسن ماند پڑ گیا۔ مارواڑی بنیے کی بہو کا حُسن و جمال اور گھونگھٹ تو وہی ہے مگر ناز بھرا لٹکا جو ایک نزاکت کے خم کے ساتھ آگے بڑھا رہتا تھا ٹوٹ گیا۔ اس عالم بگل کی کئی دلفریب مورتیں غائب ہو گئیں۔ غرض سب کو زوال اور انقلاب نے کچھ نہ کچھ نقصان پہونچا دیا۔ اپنی حالت پر قائم ہیں تو وہی دونوں بلڈاگ جنھوں نے جام خضر کا جھوٹن پی گئے ابد کے دامن سے اپنا دامن باندھ لیا ہے۔

اب بھی جب کبھی اُس کمرے میں جائیے تو ایک عبرتناک سناٹے کے تُو صد لٹکے میں سب کے آگے یہ بلڈاگ کی جوڑی نظر آتی ہے جو ہر آنے والے کی نگاہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور خوفناک خاموشی کے اندر یہ منظر دیکھ کے دل دہل جاتا ہے کہ ایک طرف ہمارے دوست کورٹ انسپکٹر صاحب اپنے آگے جھکے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھے ہیں اور سامنے انگیٹھی کی کانس پر یہ دونوں کُتے تیار ہیں کہ اِس خاموش خلوت گاہ اور اس حریم عبرت میں جو کوئی قدم رکھے اُس کی صورت دیکھتے ہی بے اختیار بھونک اٹھیں۔

اصل یہ ہے کہ اب تو ہم بھی اُن کتوں سے خائف ہیں کہ دیکھیے ہمیں بھی زندہ چھوڑتے ہیں یا نہیں۔ اور سامنا ہوتے ہی اکثر اُن کی طرف دیکھ کے دل میں یہ شعر پڑھ لیا کرتے ہیں

ندانم کہ تیر خدنگ قضا مرا بشکند پیشتر یا تُرا

ہیرامن توتا

ہمارے شاعروں نے بُلبل اور پپیہے وغیرہ کی نغمہ سنجی و شوریدہ بیانی سے تو اپنے پُرسوز کلام میں جا بجا فائدہ اُٹھایا۔ مگر سرخ رُو و زمردیں پیرہن توتے کی طرف کبھی توجہ نہ کی جو پری جمال مہ جبینوں کا پرانا انیس صحبت اور سچا ہمدم و ہمراز ہے۔ جو لوگ سگ لیلیٰ کے دلدادہ ہوں اُن سے اتنی بڑی

اہم فروگذاشت قابل معافی نہین ہو سکتی۔

توتا اور مَینا دونون حسینون کے پیارے مصاحب ورمحفل جانان کے زبان آور و بذلہ سنج قدیم ہین۔ مگر بہشتی خلعت پہننے والے توتے کو دلدار ناز آفرین کی ہمصحبتی کا جس قدر موقع ملا ہے بھولی بھالی سیہ پوش مَینا کو نہین نصیب ہوا۔ ہندوستان کی مشہور و معروف مہوش پدماوت کا سب سے بڑا ہمدم و ہمراز اور دلداری کرنے والا مصاحب وہ عجیب و غریب توتا تھا جسکے لیے پہلے پہل "ہیرامن" (جواہر طبع) کا خطاب تجویز کیا گیا۔ اور جسکی برکت سے اُس کی ساری نوع یعنی ہر توتے کا نام "ہیرامن" قرار پا گیا۔

اور توتے تو فقط سے سنائے فقرے زبان سے ادا کر دیا کرتے ہین مگر ہیرامن کو خدا نے زیور عقل سے اس قدر آراستہ کیا تھا کہ پدماوت سے بے تکلف باتین کرتا۔ اُس کی سُنتا۔ اپنی کہتا۔ اور مشکل معاملون مین مشورہ دیتا۔ اسی قدر نہین۔ اس توتے نے چتوڑ کے راجہ رتن سین کے ساتھ اُسکی نسبت ٹھہرائی۔ عالم حسن و عشق کا نامہ بر بنا۔ محبوب کا سفیر بن کے گیا۔ اور جواب لایا۔ جن واقعات کو بھاکا کے جادو بیان شاعر ملک محمد جائسی نے اپنی منظوم کتاب پدماوت مین تفصیل و تشریح سے بیان کیا ہے۔

اس توتے کے حالات کو اکثر لوگ ایک بے بنیاد کہانی خیال کرتے ہین۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر توتے کی گفتگو مین اکثر سمجھ اور ارادہ پایا گیا ہے اور بعض اوقات اُس نے ایسی ہوش و حواس کی باتین کین کہ سننے والے دنگ رہ گئے۔ چنانچہ تاریخ گجرات "مرآۃ سکندری" مین مذکور ہے کہ دولت مغلیہ کے نامور شہنشاہ ہمایون نے گجرات کے فرمانروا بہادر شاہ پر فوجکشی کی تو قلعہ جانپانیر کا محاصرہ کیا جو بہادر شاہ کا مستقر اور اُسکی قلمرو کا سب سے زبردست قلعہ تھا۔ اور سلطان بہادر کا معتمد علیہ سپہ سالار اور میر آتش یعنی ناظم توپخانہ رومی خان ہمایون سے مل گیا۔ اور اپنی سازش سے قلعہ پر مغلون کا قبضہ کرا دیا۔ فتح کے بعد جب وہان کا مال غنیمت ہمایون کے دربار مین پیش کیا گیا تو اس مین ایک زباندان توتا بھی تھا جو آدمی کی طرح باتین

کرتا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا۔ سلطان بہادر اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھتا تھا۔ شاہانہ اہتمام سے اُس کی داشت کی جاتی اور خلوت و جلوت میں ہر گھڑی فرمان روائے گجرات کا مونس و ہمدم رہتا۔ جب وہ ہمایون کے سامنے پیش ہوا اور اُسکی صفت بیان ہو رہی تھی کہ چوبدارون نے عرض کیا "رومی خان حاضر ہے"۔ اُسے باریابی کی اجازت دی گئی۔ اور جیسے ہی وہ تخت شاہی کے سامنے آکے آداب بجالایا۔ توتے نے اُس کی صورت دیکھتے ہی کہا "پھٹ پاپی رومی خان نمک حرام" توتے کے اس کلمے کے ساتھ ہی رومی خان کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔ سارا دربار متحیر ہوگیا۔ اور ہمایون نے کہا "رومی خاں۔ چکنم کہ جانور ست ورنہ زبانش می بریدم" یعنی رومی خان کیا کرون مجبور ہون کہ یہ جانور ہے ورنہ اس کی زبان کاٹ لیتا۔

توتے کی زبان آوری و زبان دانی کے صدہا قصے ہماری صحبتون میں مشہور ہیں۔ جن میں چاہے کسی قدر مبالغہ ہو مگر اصلیت سے خالی نہیں ہیں۔ خود ہمارے گھر میں ایک توتا تھا جس کا پنجرا دروازے کے قریب لٹکا رہتا۔ جہان دروازے پر کسی فقیر نے صدا لگائی وہ بے تکلف کہ دیا کرتا "شاہ جی لیتے جاؤ"۔ فقیر کسی چھوٹے بچے کی آواز خیال کرکے اُس قسم کی دعائیں دینے لگتا جیسی کہ بچون کو دی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہی یہان کے ایک اور معمولی توتے کا واقعہ ہے کہ گھر تمام لڑکے ایک محترم بزرگ خاندان کو "بابا" کہا کرتے۔ توتا بھی اُنکو بابا کہنے لگا۔ ایک دن اُس کا پنجرا بالاخانے پر لٹکا ہوا تھا کہ ایک بڑا بھاری بندر آکے اُسکے پنجرے کو اُٹھالے چلا۔ ساتھ ہی توتے نے غل مچایا "ارے بابا! ارے بابا!" سب کو خبر ہو گئی۔ اور پنجرا بندر کے ہاتھ سے چھینا گیا۔

یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ توتا فقط بولیان نہیں سیکھتا بلکہ بعض اوقات اُس میں اتنی عقل آجاتی ہے کہ سمجھ کے بات کا جواب دینے لگتا ہے۔ یا اپنی سیکھی ہوئی بولیون کو ٹھیک موقع اور صحیح محل پر استعمال کرنے لگتا ہے۔

انگریزوں میں بھی ہمارے یہاں کی طرح توتے کے باتیں کرنے کے صدہا واقعات مشہور ہیں۔ چنانچہ رابنسن کروسو کے افسانے میں جو بعض لوگوں کے نزدیک تاریخی واقعہ ہے ایک توتے کی باتوں کا ذکر ہے۔ جس نے غربت و بیکسی میں اُس کی مدد کی تھی۔

اسی وجہ سے یورپ کی مہ جبین دلربائیں بھی توتے کی دلدادہ ہیں۔ دربارِ حسن میں توتے نے اپنی باتوں سے ایسی خصوصیت حاصل کرلی ہے کہ ہر پری جمال نازنین کا محبوب دوست اُس کا توتا ہی ہوا کرتا ہے۔ فسانہ عجائب ایک فرضی قصہ ہے اور اُس میں داستان کا آغاز توتے ہی سے ہوا ہے۔ جانِ عالم نے ایک بولتا توتا مول لیا۔ گھر میں لایا۔ اُس کی ملکہ نے اپنے حسن پر ناز کیا۔ توتے نے اُسکے حُسن کی مذمت کرکے ایک دوسری مہ جبین انجمن آرا کے حُسن کی تعریف کی۔ اور جانِ عالم کو اُس کا عاشق بناکے دیوانہ بنا دیا۔

اس قصے میں توتے کا خیال غالباً پدماوت کے واقعے سے لیا گیا ہے۔ لہذا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی حسن و عشق کے عالم میں توتا کیا چیز ہے۔ اور حسینوں کے ساتھ اُسے کیسی خصوصیت ہے۔ اسی کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ جس طرح ہندوستانی دیومالا میں حسین دیویوں کے خاص خاص شعار اور باہنے مقرر کردیے ہیں۔ مثلاً کسی دیوی کا شعار مور ہے۔ کسی کا شعار یہ ہے کہ ہاتھی اُس پر ہار چڑھا رہا ہے۔ اُسی طرح یہاں کی عام دل رُبا نازنینوں اور پری وش مہ جبینوں کا شعار اور باہنا اکثر توتا قرار پاگیا ہے۔ اگلے مصوروں نے اگر کسی معشوق کی تصویر بنائی ہے تو اُس کے پاس ایک توتا بھی بنا دیا ہے۔ جس سے باتیں کرکر کے وہ خوش ہو رہی ہے۔ عشرت کدۂ نازنین وہی اُس کا دل بہلانے والا مونسِ تنہائی ہے۔ اور اُسی پر اُسکے دل کے جذبات آشکارا ہوتے ہیں۔

محبوبوں کے ایسے رفیق، انہیں کی طرف سے حُسن پرست شاعروں کا اس قدر غافل ہو جانا بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا وہ اُسے اپنا رقیب سمجھے؟ ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ رقابت کا وہم ادنیٰ ادنیٰ چیزوں

اور معمولی باتون پر ہو جایا کرتا ہے۔ دل اسکو مشکل سے گوارا کرتا ہے کہ جسے ہم چاہتے ہین وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو یا کسی دوسرے سے باتین کرے۔ لیکن ایسا تھا بھی تو توتے کی شکایت کیا کرتے۔ ہمارے عاشق مزاج رقیب سے جلتے ہین۔ اور جلنے ہی کی وجہ سے اُس کی شکایتون کا دفتر کھول دیا کرتے ہین۔ مگر توتے کی رقابت مین کیا خصوصیت ہے کہ اُس کا نام بھی نہین لیا جاتا۔

غرض ہمارے نزدیک اسکی کوئی صحیح توجیہ نہین ہو سکتی۔ اور دراصل عاشقانہ شاعری کی یہ بڑی فرد گذاشت ہے۔ لہذا ہمارے شعرا کو چاہیے کہ ابھی اس غلطی کا اعتراف کرین۔ اور آیندہ توتا مضامین حسن مین ضرور شامل کر لیا جائے۔

توتا علاوہ حسینون کا محرم راز ہونے کے خود بھی حسن کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ اُس کی سُرخ یاقوت کی سی چونچ جوہری جمالون کی ناک کے مشابہ ہے کس قدر خوبصورت ہے؟ اسکی نازک اندامی کیسی دلکش ہے؟ اور پھر اس نزاکت پر اُس کا بہشتی سبز حُلہ جو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خاص جنت سے حورون کے ہاتھ سے سیا ہوا جوڑا پہن کے دنیا مین آیا ہے۔ اور جنت سے نہین آیا تو کسی ناز آفرین و شوخ طبع محبوبہ نے اُسے اپنا دھانی دوپٹہ اُڑھا دیا ہے۔ یہ سب چیزین ایسی ہین کہ اس نازک اندام و خوش جمال طائر کو بجائے خود ایک محبوب دلربا ثابت کر رہی ہین۔

عالمگیر قتال مغرب

دنیا والون کی آج تک ہمیشہ کٹتے مرتے ہی گذری ہے۔ یہ سب جانتے ہین کہ امن و امان سے بہتر کوئی نعمت نہین۔ تہذیب اور علمی ترقی ہمیشہ یہی تعلیم دیتی ہے کہ صلح جوئی سے بہتر کوئی اخلاقی خوبی نہین ہے۔ انسان کا نام انسان اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس مین اُنس اور میل جول کے جذبات ہین۔ اور وحشی درندون کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا رہنا اُس کا کام نہین

لیکن حیرت اور بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہی انسان جس نے اپنا نام انسان رکھا ہے اُس سے بھی بے لڑے بھڑے نہین رہا جاتا۔ تعلیم۔ تہذیب۔ مذہب اخلاق سب خاموشی کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتے ہین۔ مگر اسکی یہ حالت ہے کہ علم وفضل اور تہذیب و معاشرت مین جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے اُسی قدر زیادہ لڑاکا اور خونخوار ہوتا جاتا ہے۔

موجودہ دَور تہذیب سب سے زیادہ مدعی امن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل کی شائستگی نے خونریزی موقوف کردی۔ اور جہان کہین اس جدید تہذیب کا اثر پڑا ہے وہان قتل و خون کا بازار سرد پڑ گیا ہے اور لوگ نہایت ہی امن وامان کی زندگی بسر کرنے لگے ہین۔ اگلی خون ریزیون کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے کہ صرف اپنے عقائد کے تسلیم کرانے اور اپنے گروہ کی بات بالا کرنے کے لیے وہ ملکون مین شمشیر قتال بلند کراتا تھا۔ اور موجودہ تہذیب نے چونکہ مذاہب کا اثر کمزور کردیا ہے اس لیے لوگون مین خونریزی موقوف ہو گئی اور دنیا کو پنپنے کا موقع ملا ہے۔

لیکن تجربے نے آخر کار ان دعوون کو بھی توڑ دیا۔ اور ہم دیکھ رہے ہین کہ ان حاملان لوائے تہذیب اور برہم کنان صفوف ادیان کے ہاتھون سے ایسی خون ریزی ہو رہی ہے جیسی کہ آج تک دُنیا مین کبھی نہین ہوئی تھی اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ علم وفضل اور تہذیب و تمدن مین جرمن اور فرانس کا مرتبہ آج کل دنیا کی تمام قومون سے بڑھا ہوا ہے۔ اور ان کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ انگلستان اور امریکہ کا خیال کیا جاتا ہے جن کی نسبت یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ تحصیل زر کو علمی ترقی کے شوق پر ترجیح دیتے ہین لیکن انھین تینون اکثر کے ہاتھون سے آج کل دنیا پر ایسے ظلم ہو رہے ہین اور نوع انسان اس بیرحمی سے قتل ہو رہی ہے کہ اُسکی نظیر سے دنیا کی تاریخ خالی ہے اور کبھی مذاہب کے ہاتھون سے ایسا قتل عام نہ ہوا تھا۔ دولت برطانیہ نے بہت الگ رہنا چاہا مگر نہ بن پڑی اور مجبوراً اُسے بھی اپنے ہاتھ خون مین رنگنا پڑے۔

تاریخ عالم کے آغاز میں ہمیں مشرق میں مہا بھارت اور رامائن کی لڑائیاں اور مغرب میں ٹرائے کی معرکہ آرائیاں نظر آتی ہیں - اول الذکر دونوں لڑائیوں کے مرد میدان ہندو اور تیسری جنگ کے سورما یونانی تھے - دونوں کے شعرا اپنی ان لڑائیوں کو دنیا بھر کی لڑائیوں سے بڑا بتاتے ہیں - لیکن سچ پوچھیے تو تینوں میدان قومی اولوالعزمی اور مقامی سپہگری کے اعلیٰ ترین دنگل ضرور تھے - مگر انکے حالات کے بیان کرنے میں شعرائے قوم نے بہت ہی مبالغہ کیا ہے - کیونکہ اُس عہد کی قلت آبادی کے لحاظ سے نہ اُن میں جانبازوں کی اتنی کثرت ہو سکتی تھی اور نہ موجودہ ذرائع سفر کے مفقود ہونے کی وجہ سے اُن کی خون ریزی کا میدان اتنا وسیع ہو سکتا تھا -

اُسکے بعد ہزاروں سال تک اسی قسم کی حملہ آوریوں اور خونریزیوں کا میدان گرم رہا - اسیریا و بابل والوں کا ارض یہودا پر آنا اور ساری نسل اسرائیل کو تباہ کر دینا - زرکشیز کا (جسے بعض محققین کیخسرو عجم خیال کرتے ہیں) اپنے بیس لاکھ سپاہیوں کے ساتھ یونان پر چڑھائی کرنا اور بحری لڑائی میں بالکل تباہ ہو جانا - رومیوں کا قرطاجنہ والوں سے لڑنا اور اُنھیں تباہ کرنا - گوتھ اور ہُن کی سی وحشی قوموں کے سیلاب کا مملکت روم میں آنا اور رومی تمدن و تہذیب کا غارت ہونا - صحرانشینان عرب کے عالمگیر لشکروں کا عرب سے نکلنا اور مشرق سے مغرب تک ساری متمدن دنیا کو زیروزبر کر دینا - صلیبی مجاہدوں کے ٹڈی دل کا کوہستان آلپس سے نکل کر بنی اسرائیل کی موعودہ زمین پر گرنا اور صدیوں تک خالص دینی مقاصد پر نوع انسان کی قربانی ہوتے رہنا - اور سب کے آخر میں قراقرم کی گھاٹیوں اور دشت قپچاق کے صحرا سے تاتاری درندوں کے طوفان کا اُٹھنا اور عربی تہذیب کے ساتھ لاکھ آدمیوں کو عدم آباد میں اُڑائے جانا -

یہ سب ہوا - اور اس میں خدا کی کروڑوں مخلوق تلوار کے گھاٹ اُتری مگر وہ وحشی تھے، جاہل تھے، غیر مہذب تھے، اور تمدن سے مس نہ رکھتے تھے لیکن مہذب دنیا میں تعلیم و تہذیب کے اعلیٰ ترین کمال پر پہونچنے کے بعد بھی

خون کا سیلاب بہے - اور انسان کی سی بے نظیر امانت خاک مین ملائی جائے تو پھر ہمین یہی کہتے بنتا ہے کہ یہ مثل " لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا" جانورون ہی تک محدود نہین بلکہ انسان کو ہزار پڑھایئے لکھایئے - لاکھ مہذب و شایستہ بنایئے اصل مین وہ ایک خونخوار درندہ ہی ہے - صلح کی برکتون کا یقین رکھنے اور امن وامان کے فائدون سے واقف ہونے پر بھی ادنی سی چھیڑ پر لڑ ہی پڑتا ہے -

اگلی غیر مہذب لڑائیون کے بعد اب ہم مہذب لڑائیون کا ذکر کرتے ہین - اُن کا آغاز نپولین بونا پارٹ کی اولوالعزمیون سے ہوا - جس نے سارے یورپ اور مصر و شام مین ہل چل ڈال دی اور اپنی ملک گیری کی ہوس پر لاکھون آدمیون کی قربانی چڑھائی - اُس کے بعد اسی تہذیب کا تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ کو جس سے یون پیش پانا دشوار تھا رفتہ رفتہ کمزور کیا جائے - پہلے نویرینو کی بحری لڑائی مین زبردست دول یورپ نے مل کے عثمانی بیڑے کو بالکل تباہ و غرق کر دیا - اور ہزارون آدمی بحر فنا مین غرق ہوے - پھر کریمیا کی لڑائی ہوئی جس مین مہذب دول یورپ کا مقصد یہ تھا کہ روسی اثر جنوب مین بڑھنے نہ پائے - اور ترکون کو کسی قسم کا فائدہ نہ ہو - لکھوکھا خلقت اس لڑائی مین بھی ضائع ہوئی - اسکے بعد فرانس و جرمن کی پہلی لڑائی ہوئی جس مین لاکھون بندگان خدا جرمنی کے شوق ملک گیری پر بھینٹ چڑھے - بعد ازان روسیون اور ترکون کی لڑائی ہوئی جس کے لیے ایک زمانہ سے اُنکے صوبون مین فساد کرایا جاتا تھا - اُنکے وزرا کو رشوتین دی جاتی تھین - اُنکی رعایا مین شورش پیدا کرائی جاتی تھی آخر لڑائی چھڑ گئی - اور تہذیب و بدتہذیبی دونون طریقون سے لاکھون آدمی دونون حریفون کی فوجون اور رزمگاہ کی رعایا مین سے قتل ہوے - ترکون نے آخر کئی صوبے آزاد کر کے جان چھڑائی اور امن وامان قائم کرنے کی فکر کرنے لگے - مگر زبردست فتنہ پردازون کی سازشون کے سامنے ایک کمزور صلح جو کا کیا زور چل سکتا تھا - کبھی چین سے تشنجیانہ تشبیب ہوا - مہذب دنیا کا یہ عام مشغلہ تھا کہ جب کوئی اور فکر نہ ہوتی

تو جزیرہ نمائے بلقان اور قلمرو عثمانیہ کے پالیٹکس مین مفسدانہ دخل دہی شروع ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ جاپان (جس نے مغربی عقابون کی نظر سے بچ بچ کے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور مہذبان مغرب ہی کا سا مہذب بن گیا تھا) نے سر اُٹھایا اور خم ٹھوک کے روس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بحری و بری دونون لڑائیان ہوئین اور لکھوکھا آدمی دونون کے اغراض حکمرانی پر قربان ہوے۔ آخر بڑی مصیبت سے روس نے جان بچائی۔ اب چند روز بعد تہذیب کا یہ تقاضا ہوا کہ اسلامی سلطنتون کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ایران سے مراکش تک ہر جگہ لڑائی چھڑ گئی۔ روس نے ایران کی پھڑپھڑانے والی بے بس رعایا کو دبوچا۔ اٹلی نے بے پوچھے گچھے اور بے وجہ موجہ طرابلس کے ساحلی شہرون پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے بڑھ کے مراکو کا گلا دبایا۔ پھر جب اقصائے تہذیب کے صلح پسندون نے دیکھا کہ اٹلی کا طرابلس پر کوئی زور نہیں چلتا ہمت ہارے دیتا ہے۔ اور اُس کے حواس بجا نہین۔ تو سب طرف سے تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ طرابلس سے دست بردار ہو کے صلح کر لے۔ اور کچھ ایسی ریشہ دوانیان، چالاکیان اور سازشین کی گئین کہ عثمانی وزارت نے اُسکو قبول بھی کر لیا۔

ادھر مہذب احباب یورپ کی صلاح سے اس صلحنامے پر دستخط ہوے اور اُدھر انھین کرمفرماؤن کی عنایت سے تمام ریاستہاے بلقان نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ مین اشتہار جنگ دے دیا۔ اور سارے جزیرہ نما سے بلقان مین خون کی ندیان بہنے لگین۔ دولت عثمانیہ ان سب کے مقابلہ مین کمزور نہ تھی۔ مگر حسن تدبیر سے وہ کمزور کر دی گئی۔ جان باز سپاہیون کو بیٹھ کی روٹی اور سامان جنگ دونون سے محروم رکھ کے پٹوایا گیا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سوا تھوڑے سے مشرقی علاقہ یورپ کے جو قسطنطنیہ کے حوالی مین ہے تمام مقبوضات یورپ دولت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گئے۔ اور جن علاقون پر نصرانی ریاستہاے بلقان کا قبضہ ہوا تھا اُن مین مسلمان رعایا پر ایسے مظالم ہونے لگے کہ سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین۔ غرض لاکھون خلقت امن

کے زمانے میں بھی تہذیب یورپ کی نذر ہوئی۔

لیکن جو دولت ترکان آل عثمان سے چھینی گئی تھی اُسکا ہضم ہونا آسان نہ تھا۔ غیر منقولہ مال غنیمت کی تقسیم مین دشواریان پیش آئین۔ اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ جرمنی کی ایک ایسی صاحب علم و فضل قوم نے جو موجودہ ترقیوں کا اعلیٰ ترین نمونہ تصور کی جاتی تھی روس کے مقابل اشتہار جنگ دیا۔ اور فرانس پر صرف اس لیے کہ وہ سلطنت روسیون کی دوست ہے فوج بڑھائی۔ بلجیم کی غیر جانبداری کے قائم رکھنے کا جو پُرانا عہدنامہ تھا اُسکے ساتھ خود بلجیم کو بھی پامال کر ڈالا۔ جس کی وجہ سے انگلستان کی ایسی صاحب علم اور صلح جو سلطنت کو بھی اسکے خلاف اشتہار جنگ دیدینا پڑا۔ اور ایک ایسی لڑائی چھڑ گئی جو دنیا کی تمام گذشتہ لڑائیون سے زیادہ خوفناک ہونے کے ساتھ ساری دنیا مین پھیلی ہوئی ہے۔ یورپ مین چار طرف شمال و مشرق مین روس و جرمن کی سرحد پر۔ وسط یورپ مین روس و آسٹریا کی سرحد پر۔ شمالی بلقان مین سرویا و آسٹریا کی سرحد پر اور مغربی یورپ مین بلجیم اور فرانس مین کئی ہزار میل کی مسافت پر خون کا مینہ برس رہا ہے۔ ایشیا اور انتہائے مشرق مین سواحل چین پر۔ افریقہ مین زنجبار سے لیکے شمالی و مغربی سواحل افریقہ تک۔ اوشینیا یعنی جزائرستان مین اسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے پاس کے جزائر مین خونریزی ہو رہی ہے۔ اور سمندر جو اگلے دنون آزاد رہا کرتا تھا آج کل عموماً خطرناک ہے۔ اور جو خطرہ بالٹک اور ناروے کے سواحل سے شروع ہوا اُس سے اٹیلنٹک اوسن۔ پے سفک اوشن۔ آرکٹک اوشن اور انڈین اوشن تک خطرہ سے خالی نہین ہین۔

بلقان کے مظلوم مسلمان سعدیؔ کا یہ شعر پڑھ رہے ہین

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را ۔۔۔ چندان امان نداد کہ شب را سحر کند

اور ہمین مہذب قومون کا یہ رنگ دیکھ کے یہی ماننا پڑتا ہے کہ تہذیب و شائستگی سوا اسکے کہ انسان کو لڑائی کے لیے زیادہ تیار کرے اور اُس کی خونریزی کی قوت و ہوس کو اور بڑھائے اور کچھ نہین کرتی۔

موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!!

حیدرآباد دکن میں جو ہیبت ناک اور تباہ کرنے والا سیلاب موسیٰ ندی سے آیا تھا اُس پر مولانا نے یہ مضمون اکتوبر ۱۹۰۸ء کے دلگداز میں تحریر فرمایا۔

موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!! تو نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام اختیار کیا ہے۔ اور تیری پڑوسن عیسیٰ ندی نے جو حیدرآباد سے وہی ڈھائی میل پر تجھ سے آکے ہم آغوش ہو گئی ہے حضرت عیسیٰ کا نام۔ اور اعلیحضرت سرکار دکن کے دار السلطنت میں جیسی شان و شوکت نمودار ہوئی اُس سے ہم کو یقین آ گیا تھا کہ تم دونوں سے ید بیضا کا معجزہ بھی نمایاں ہو رہا ہے اور احیاے موتے کا بھی۔

ہم تیری سطح پر آفتاب کی کرنوں کو کسی کی پُر افشاں پیشانی کی طرح چمکتے دیکھتے تو اُسے ید بیضا تصور کرتے۔ اور ہر مرتبہ جب ہم اپنے تاجدار گردون مدار کی فیاضی سے کسی کو نہال ہوتے دیکھتے تو اسے احیاے موتےٰ کا معجزہ سمجھتے۔

مگر موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!! ہمیں تیری معجز نمائی کے اس پہلو کا خیال ہی نہ تھا کہ تو ید بیضا کے بجاے حضرت موسیٰ کا عصا بھی بن سکتی ہے۔ عصاے موسیٰ کی شان دکھانی تھی تو کاش یہ رحمت دکھائی ہوتی کہ "فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا" (جاری ہوے اُس سے بارہ چشمے) تجھ سے دس بارہ ندیاں ندیاں جدا جدا جاری ہو جاتیں۔ اُن سے سرکار عالی کا ملک پہلے سے زیادہ آباد ہوتا۔ اور رعایا کی مرفہ الحالی ترقی کرتی۔ لیکن موسیٰ ندی! تجھ سے تو عجب شان قہاری ظاہر ہوئی۔ تو ایک آنًا فانًا عصاے موسیٰ سے وہ عظیم الشان اژدہا بن گئی۔ جو دم بھر میں مصر کی ہزارہا خلقت کو نگل گیا تھا۔

جس نے ایک چشم زدن میں مصر کی آبادی صاف کر دی تھی۔ افسوس موسٰی ندی! ہمیں تجھ سے ایسی امید نہ تھی۔

عصائے موسٰی کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ سمندر میں راستے ہو گئے۔ پانی جہاں تھا وہیں دیواروں کی طرح ٹھیر گیا۔ ہمارے زمانے کے آہنی پلوں کی طرح اُن میں جھنجریاں بن گئیں۔ اور بنی اسرائیل کے بارہ سبط بارہ راستوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے بھالتے اطمینان و فارغ البالی سے پار چلے گئے۔ اور ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ فرعون کے لشکر نے جیسے ہی اُس دریائی راستہ میں قدم رکھا پانی جوش و خروش کے ساتھ مل گیا۔ سمندر تھارہی کی شان سے اُبلنے لگا۔ قیامت کا تلاطم نمودار ہوا اور دم بھر میں اُس لشکر کا پتہ نہ تھا کہ کیا ہوا اور کدھر گیا۔ زمین کھا گئی یا آسمان کھا گیا۔

بیشک ہم گنہگار ہیں۔ سر سے پانوں تک معاصی میں ڈوبے ہوے ہیں۔ ہمارا بال بال گناہوں سے گُندھا ہوا ہے۔ مگر موسٰی ندی! ہم سب خدا پرست ہیں۔ ہمارے مشرک بھی فی الحقیقت موحد ہیں۔ ہمارے کفار بھی اُس ذات وحدہٗ لا شریک کے منکر نہیں۔ پھر ہمارے ساتھ تجھے ایسا سلوک نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہم پر یہ جوش غضب ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے ظل اللہ الحمد للہ کہ سچے خدا پرست اور خدا کے برحق دین کے حامی و مربی ہیں۔ ہمارے مدار المہام تصوف کے رنگ میں رنگے ہوے اور دریاے وحدت و معرفت میں غرق ہیں۔ ایسے نیک لوگوں اور ایسی خدا پرست آبادی کے ساتھ وہ وہ سلوک جو کبھی فرعون اور اُس کے لشکر کے ساتھ کیا گیا تھا! موسی ندی! انصاف یہ ہے کہ تیرا یہ جوش بے محل اور تیرا یہ غیظ و غضب بے موقع تھا! ہم سیہ کار سہی۔ مگر اتنے بد تر بھی نہ تھے کہ تو ہمارے حق میں عصاے موسٰی کی شان تھاری دکھانے کے لیے خلقت کو نگل جانے والا اژدہا بن جائے۔

موسٰی ندی! موسی ندی!! تیرے اس سیلاب کو کوئی طوفان نوح سے تشبیہ دیتا ہے اور کوئی سیل عرم بتاتا ہے۔ ہو۔ مگر ان دونوں تاریخی واقعات کے ہولناک سین قدامت کے پردے میں چھپ گئے۔ اور اُنکے جگر خراش

مناظر بعد کے دُھندلکے میں ہیں۔ ہمیں تو تجھ میں کوہ ویسے وی اُس کی شان نظر آ رہی ہے۔ اور تیرا سیلاب اُس کے آتشین لاوے کا سیلاب معلوم ہوتا ہے جس میں ایطالیہ کا شہر پومپیائی غرق ہو گیا تھا۔ ویسے وی اس کے آتشین سیلاب نے پومپیائی کو چاروں طرف سے محصور کر لینے کے بعد اندر قدم رکھا تھا۔ اُسی طرح تیرے سیلاب نے شہر کی اندرونی آبادی کے بعض محلوں کو جبکہ لوگ غافل سو رہے تھے ہر چہار طرف سے گھیر لیا۔ اور اُنھیں ایک خطرناک جزیرے میں محصور کرنے کے بعد ڈبو یا۔

مگر پومپیائی کے غریق بحر آتشین آج دو ہزار برس بعد نکل رہے ہیں اُس سیلاب نے اُنھیں اپنے دامن کے نیچے محفوظ رکھا۔ جنھیں آج کل کی زندہ دنیا اگلے عبرت ناک سیلاب کی یادگار سمجھ کے دیکھتی ہے۔ اور اُنکی حالت دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں۔ مگر موسیٰ ندی! تو تو بتا کہ ہمارے مُردوں کو بہا کے تو کہاں لے گئی؟ اور اُنھیں کہاں رکھا ہے؟ کہ ہم نے ملنے جلنے اور لطف صحبت اُٹھانے کے نہیں تو انکی حسرتناک صورتیں دیکھنے ہی کے لیے ہم اُن کا نظارہ کر سکیں۔ اُنھیں کہیں امانت رکھا ہے یا سمندر کے قعر میں پھینک آئی؟ موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!! یہ مُردے نہیں یہ ہماری امانتیں ہیں جنھیں ہم تجھ سے لیں گے۔ آج نہیں تو کل قیامت کو لیں گے۔ ایک دن ضرور آنے والا ہے جب اے اژدہا صفت ندی تجھے اپنے یہ لذیذ لقمے اُگلنے پڑیں گے۔ اور تجھے اپنے اس ظلم و ستم کا یقیناً جواب دِہ ہونا پڑے گا۔

آہ! تیرا غیظ و غضب! تیرا جوش و خروش! تیری بے رحمی و سنگدلی! تیری وہ غضبناک صورت! تیری وہ پُرشکن جبین! تیری وہ بدحواس کر دینے والی ہیبت! تو کیا تھی اور ایک دم میں کیا ہو گئی! تجھے کیا سمجھے ہوئے تھے اور کیا نکلی! وہ دیکھو لوگ بدحواس بھاگے جاتے ہیں کسی کو اپنے پرائے کا ہوش نہیں۔ پردے کی بیٹھنے والیاں ننگے سر ننگے پانوں گھروں سے نکل پڑی ہیں۔ مائیں بچوں کو بھول آئی ہیں۔ بیٹے! پوتوں کو

نہین یاد رہے ہین۔ بہن بھائی سے چھوٹ گئی ہے اور شوہر جورو کو چھوڑ آیا ہے۔ یہ کہان بھاگے جاتے ہین؟ اور اس قدر بدحواس کیون ہین؟ اسلیے کہ کہ موسٹی ندی اس بھوکے اژدہے کی طرح پیچھے دوڑی آتی ہے۔ وہ سڑکون پر سانپون کی طرح لہرا لہرا کے دوڑ رہی ہے کہ کوئی ملے تو اُسے ہڑپ کر جائے۔ گلی کوچون مین رینگ رہی ہے کہ کوئی انسانی شکار ہاتھ آئے تو اُسے ہضم کرلے گھرون مین گھستی ہے کہ کوئی تھکا ماندہ رہ گیا ہو تو اُسے اپنا نوالہ بنائے۔ اپنی قہار بھوک سے وہ بیتاب ہے۔ چارون طرف زندہ مخلوق کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ ہزارون بندگان خدا کو نگل گئی اور پیٹ نہین بھرتا۔ اُس کی قیامت خیز چال مکانون کو گراتی اور عالیشان عمارتون کو ڈھاتی جاتی ہے۔ جدھر جاتی ہے ٹھراؤ ہوجاتا ہے اور جہان پہونچتی ہے بالکل صفایا نظر آتا ہے۔ وہ غریب بیمارے جو نہ بھاگ سکے ہین اور نہ اس ظالم ندی کے تیھے چڑھ سکے ہین جن مکانون مین اُنھون نے پناہ لی تھی اُنھین مین دب دب کے اور خود اپنی بنائی ہوئی عمارتون کے نیچے پس پس کے جان دے رہے ہین۔

مگر یہ تصویر اُن مقامات کی ہے جہان لوگ تیرے حملے سے پہلے چونک اُٹھے ہین۔ اُنھین تھوڑا بہت بھاگنے کا موقع مل گیا ہے۔ اور اپنے عزیزون کو ڈوبتے اور مکانون مین دبتے اور بیکسی سے جان دیتے دیکھتے ہوے گرتے پڑتے بھاگے ہین۔ لیکن اُن جگہون کی خونی تصویر دیکھی بھی نہین جا سکتی جہان تونے اپنا جوش دکھانے سے پہلے ہی لوگون کو اپنے آغوش مرگ مین گھیر لیا ہے وہان کا عالم! عالم مرگ! عالم تباہی! عالم بیکسی و بے بسی! نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے۔ جنھین خبر ہوگئی ہے کہ موت سر پر آ پہونچی حسرت و یاس سے بھاگے ہین۔ مگر ہر طرف راستہ بند ہے۔ جدھر جاتے ہین تیری لہرین موت کے فرشتوں کی طرح راستہ روکے کھڑی پہرہ دے رہی ہین کہ کوئی نکلنے نہ پائے۔ جب سب راستے بند دیکھے تو خدا کے گھر کی طرف چلے۔ مسجدون مین خلقت بھری ہوئی ہے۔ مگر تو نے اس حرم ربانی مین بھی قدم رکھا۔ اور ساعت بساعت تیرا تلاطم بڑھتا ہی جاتا ہے۔ یہان تک کہ

تیرا پانی اُبلتے اُبلتے چھتوں سے جا لگا۔ اور وہ سب پناہ گزین خدا ہی کے گھر مین سے خدا کے پاس سدھار گئے۔ یہ بھی وہ لوگ تھے جنھون نے کچھ ہاتھ پانوئن مارے۔ بہت سے تو ایسے ہین جنھین خبر بھی نہ ہونے پائی اور ان کا بستر عیش ہی بستر مرگ بن گیا۔ آہ کتنے دولھا دولھن ہین جو شب زفاف ہی مین ہم آغوشی سے آغوش موت مین چلے گئے۔ اور او موسی ندی! اُنکے چاندی کے پلنگ ہی کو تختۂ تابوت بنا کے تو اپنے دوش پر اُٹھا لے گئی۔ اور اُن کی روحون کے ساتھ اُنکے جسمون کو بھی عالم فنا مین پہونچا آئی۔

موسی ندی! تجھے کسی پر تو ترس آیا ہوتا! کوئی تو تیرے دست ستم سے بچا ہوتا۔ عبّاد کو مسجدون مین۔ برہمنون کو دَیر مین۔ طلبا کو مدرسون مین۔ صوفیون کو خانقاہون مین۔ غرض کسی کو کہین نہ چھوڑا۔ جو جہان تھے وہین رہے۔ اور تو اُنکے سرون پر جا پہونچی۔ بیبیان شوہرون کے سامنے۔ بیٹے بیٹیان مان باپون کے سامنے۔ بہن بھائی بہن بھائیون کے سامنے۔ دوست دوستون کے سامنے ڈوب ڈوب کے مر رہے ہیں اور کسی کو بچانے کی جرأت نہین ہوتی۔ وہ مرتے وقت چاہتے ہین کہ آخری وصیت کے دو کلمے اپنے عزیزون اور دوستون کے کانوں تک پہونچا دین۔ مگر نہ وہ اپنے جان کے خوف سے سُننا چاہتے ہین اور نہ تو اپنے غیظ و غضب کے شور سے سننے دیتی ہے۔ معصوم بچہ مان کے آغوش سے نکل کے تیرے بے رحم آغوش مین چلا گیا ہے اور سیہ بخت مان بے بسی سے کلیجہ تھام کے رہ گئی ہے۔ مہ جبین معشوقہ کو تیری ظالم موجون نے عاشق کے گلے سے چھڑا کے اپنے گلے لگا لیا ہے اور وہ حسرت سے دیکھ کے رہ گیا ہے۔ ایسے ایسے جگر خراش منظرون کو دیکھنا اور ترس نہ آنا۔ اے موسی ندی تیرا ہی کام ہے۔

او موسی ندی! تو اتنی سنگدل! اتنی ظالم۔ اتنی ستم کیش اور اتنی بے رحم ہے کہ تجھے نہ معصوم بچون کی معصومی پر ترس آیا اور نہ مہوش دلربائون کی نازنینی پر۔

یہ سب ہنگامہ اور یہ سارا شور محشر چند گھنٹون مین ہو گیا۔ موسی ندی

اپنا جلال و غضب دکھا کے چلی گئی۔ عالم پر خموشی اور موت کا سناٹا طاری ہے۔ نہ سڑکون کا پتہ ہے نہ گلیون کا۔ نہ آبادی کا نشان ہے نہ عالیشان عمارتون کا۔ جدھر نظر جاتی ہے پتھرون کا ڈھیر ہے اور حسرتون کا انبار۔ ایک عالم ہو ہے۔ اور چند ساعت پہلے کی رونق و عظمت کے آثار۔ امرأ القیس کہان ہے بلاؤ اور کہو کہ اپنا قصیدۂ معلقہ یہان کھڑے ہو کے سنائے۔ اس لیے کہ جو سامان حسرت یہان نظر آئے گا اس جگہ ممکن نہین جہان عنیزہ چند روز کے لیے بس کے چلی گئی تھی؟ گولڈ اسمتھ کہان ہے؟ اس سے کہو کہ اس حسرت کدہ مین آ کے اپنی پر سوز و گداز نظم "ڈزرٹڈ ویلج" سنائے یہان زیادہ اثر ہوگا۔ کیونکہ جس اجڑی بستی کا سمان اس نے دکھایا ہے ہمارے تباہی زدہ گھرون سے زیادہ تباہ نہین ہو سکتی۔ اور آخر مین حکیم معزّی سے کہدو کہ اپنے اچھوتے عربی مذاق کے قصیدے کے چند تمہیدی اشعار مین کی دھن مین گا کے ہماری حسرت نصیبی کی داد دے۔

اے ساربان منزل مکن جز بہ دیار یار من
تا یکزمان زاری کنم بر ربع واطلال و دمن

ربع از دلم پر خون کنم اطلال را جیحون کنم
خاک دمن گلگون کنم از آب چشم خویشتن

از روے یار خرگہی ایوان ہمی بینم تہی
وز قدّ آن سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

آنجا کہ بود آن دلستان با دوستان در بوستان
شد بوم و زد و دو رامکان شد گرگ و کرگس را وطن

بر جاے جام و رطل مے گوران نہادستند پے
بر جاے چنگ و نائے و نے آواز زاغ ست و زغن

آہ! آہ! ایک جہاز بھی ڈوبتا ہے تو اُس مین ڈوبنے والے پہلے ہاتھ پانون مارتے ہین۔ اور جب قسمت پر زور نہین چلتا تو اپنے نالۂ و شیون کی آواز آسمان تک پہونچا دیتے ہین۔ مگر ہمارے غریقان رحمت۔ ہمارے بے زبان مظلوم کس بہادری۔ کس خموشی۔ اور کس بے کسی سے ڈوبے ہین نہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ چل بسے۔ قافلے کے قافلے عدم کو چلے گئے اور جرس کی آواز کسی نے نہ سنی۔

سچ یہ ہے کہ یہ بھی حضرت رب العزت کے جلال کا ایک نمونہ تھا۔ قیامت آ گئی تھی۔ خاموش و منہدم کھنڈرون سے آواز آ رہی تھی کہ "لمن الملک الیوم؟"

اور عالم ہو مین سناٹا اپنی پر ہیبت آواز مین جواب دے رہا تھا "لِلہِ الواحِدِ القہار"
ہمارے حیدرآباد دکن مین تصوف کا بڑا زور ہے۔ اُمرا اراکان دولت
تک وحدت وجود کے رنگ مین ڈوبے ہوئے ہین۔ یمین السلطنۃ مہاراجہ
مدار المہام بہادر دام اقبالہ اس سرمدی مذہب کے دلدادہ اور معرفت کے
جویا ہین۔ لہذا خدا کو بھی منظور ہوا کہ نفی و اثبات کا جلوہ دکھا دے۔ یہ صرف
"لا" کا جوش تھا جس نے ایک عالم کو غرق کر دیا۔ اور اب اُسکے بعد اثبات
ہے۔ جبکہ منتظمان رلیف کمیٹی اُجڑے کھنڈرون پر ڈیرے ڈالے پڑے ہین
اور اعلیٰ حضرت سکندر حشمت کی فیاضی بھوکون کو کھانا اور ننگون کو کپڑا
دینے مین فراخ حوصلگی کے جوہر دکھا رہی ہے۔

سوگواری

کسی دوست یا عزیز کے مرنے پر علانیہ طور پر وضع و لباس کے ذریعہ سے
اظہار غم کو "سوگواری" کہتے ہین۔ دنیا کی تمام قومون کی معاشرت کو دیکھیے
تو کوئی قوم سوگ منانے سے خالی نہ نظر آئے گی۔ لہذا ہر ایک مین سوگواری
کی خاص خاص وضعین اور اُس کے اظہار کے خاص طریقے اور رسمین مروج
ہین۔ یون تو جس دن دنیا مین پہلا انسان مرا اُسی دن سے رونے اور سوگ
کرنے کی بنیاد پڑ گئی۔ مگر اس سوگ مین مختلف قومون نے جو جدتین کین اور
جیسے جیسے کرشمے دکھائے اُن کا بتانا خالی از لطف نہین ہے۔
سب سے قدیم قوم مصر والون کی ہے۔ اور اُنھین میں سوگواری تمام
قومون سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی زیادتی اور مدت تک قائم رہنے کی
وجہ یہ تھی کہ لاش کی ممی بنائی جاتی۔ جس کام کے لیے زمانہ درکار ہوتا۔ ممی
کے تیار ہونے تک مرنے والے کے خاندان مین برابر ماتم ہوتا رہتا۔ جب لاش
ممی بنانے کے لیے کسی ممی بنانے والے کے گھر مین لے جائی جاتی اور جب
تیاری کے بعد وہان سے لائی جاتی تو رونے اور ماتم کرنے والون کا اُسکے

گرد ہجوم ہوتا - کوئی سن رسیدہ عورت جو رونے اور بین کرنے میں زیادہ کمال رکھتی بال کھول کے آتی اور لاش کے سرہانے کھڑی ہو جاتی - غم و الم کی دُھن اور درد بھری آواز میں اُس کے محامد و خصائل بیان کرکے روتی - اور سینہ کوبی کرتی - اور ماتم میں تمام لوگ اُس کا ساتھ دیتے - اکثر فرعونوں اور امیروں کے مرنے پر سال بھر تک مجلس ماتم بپا رہتی اور کسی وقت رونے پیٹنے کا سلسلہ موقوف نہ ہوتا -

اُنکے بعد اور نیز اُنکے زمانے میں بنی اسرائیل جب ارض موعودہ میں جا کے مقیم ہوے ہیں تو وہ بھی بڑے جوش و خروش سے اپنے عزیزوں اور دوستوں کا سوگ کیا کرتے - اور غالبًا اظہار غم کے بھی وہی طریقے تھے جن کو وہ مصر کے قبطیوں سے سیکھ کے آئے تھے - اُن کا سوگ یہ تھا کہ گریبان چاک کرتے - کپڑے پھاڑ ڈالتے - بالوں کو نوچتے کھسوٹتے - سینہ کوبی کرتے - سر پر خاک ڈالتے - نہانا چھوڑ دیتے - فرش سے اُٹھ کے زمین پر جا بیٹھتے اور لوگوں میں ننگے سر اور ننگے پاؤں پھرتے - مرنے والے کے سوگواروں کی یہ حالت سات دن تک رہتی - جس مدت کے گذر جانے کے بعد یہ سوگواری کے طریقے موقوف ہو جاتے - مگر بنی اسرائیل نے اپنے رسم و رواج کے خلاف حضرت موسٰی اور جناب ہارُون کا سوگ پورے ایک مہینے تک قائم رکھا تھا -

اب اسکے بعد پُرانے یونانیوں کا طریقۂ سوگ دیکھیے جو علم و فضل میں سب سے بالا تھے اور اُن کا شہر ایتھنز مدینۃ الحکما کہلاتا تھا - یونانیوں میں کوئی عزیز و قریب مرتا تو اپنے بال کٹوا دیتے - کپڑے پھاڑ ڈالتے - سر پہ خاک اُڑاتے - اور اکثر شہروں میں سیاہ اور ارغوس وغیرہ خاص خاص بستیوں میں سفید کپڑے پہنتے - عام مجمع کو چھوڑ کے کسی تنہائی کے مقام میں جا بیٹھتے - زمین پر لوٹتے - لڑھکنیاں کھاتے - اور بغیر منہ پر نقاب ڈالے مجمع عام میں نہ آتے -

یونانیوں کے بعد رومیوں کا زمانہ آیا - وہ تمام باتوں یہاں تک کہ

بہت سے مذہبی عقائد میں بھی یونانیوں کے شاگرد تھے۔ چنانچہ انکی سوگواری بھی یونانیوں کی سوگواری اور اُن کے طریقۂ ماتم سے زیادہ متغائر اور جدا نہ تھی۔ اُن میں مرنے والے پر رونے اور پیٹنے اور بین کرنے کا زیادہ رواج تھا۔ اور تجہیز و تکفین کے موقعوں پر رونے والے کرائے پر بلوائے جاتے جو صف باندھ کے کھڑے ہوتے اور زور زور کے بین کرتے۔ اسکے سوا اُن میں تقریباً وہ تمام باتیں تھیں جو یونانیوں میں تھیں۔

ماتمی لباس کا رنگ بھی قدیم قوموں میں بدلا ہوا تھا۔ اور آج بھی جدا جدا ہے۔ یونانیوں میں بعض جگہ سیاہ تھا اور بعض جگہ سفید۔ رومیوں میں علی العموم سیاہ رنگ ماتمی تھا۔ یورپ میں آج بھی سیاہ ہی رنگ سوگواری کے لیے مخصوص ہے۔ اہل چین و جاپان سوگ میں سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ ترکوں میں نیلے یا عباسی رنگ کا رواج ہے۔ ایران میں سیاہ لباس پہنا جاتا ہے۔ مصر میں زرد رنگ سوگواری کا ہے۔ اور حبشیوں میں سوگ اور غم کے موقع پر خاکستری رنگ اختیار کیا جاتا ہے۔

جاہلیت عرب میں بھی مرنے والے کی نسبت بڑے زور و شور کا ماتم ہوتا تھا۔ عورتیں گریبان چاک کرتیں۔ روتیں پیٹتیں۔ اور مرثیوں اور بین کے فقروں کے ساتھ علی العموم نوحہ خوانی کرتیں اور سر و سینہ پیٹتیں۔ یہاں تک کہ اسلام ظاہر ہوا۔ اور تعلیمات ربانی سے انسانی اخلاق کی اصلاح ہونے لگی۔

اسلام نے سوا آنسو بہانے اور سادگی و تہذیب کے ساتھ رنج و الم کرنے کے سر و سینہ پیٹنے چلّا چلّا کے بین کرنے۔ زیب و زینت چھوڑنے اور ماتمی لباس پہننے کو حرام بتایا۔ چنانچہ نور اسلام کے نمایاں ہوتے ہی سوگواری اور سینہ زنی عرب میں بالکل ترک ہو گئی تھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے شہید ہونے کے بعد عزاداران حسینؑ نے سوگواری و عزاداری کو جزو دین بنا دیا۔ اور انکے جوش رنج والم نے تھوڑی ہی مدت میں سوگواری کو اس قدر اہم اور باقاعدہ بنا دیا کہ شاید

محبان حسینؑ سے زیادہ جوش عزاداری دنیا کی کوئی قوم نہ دکھا سکی ہوگی۔ اس اسلامی سوگواری کی شان دیکھنے کا جسے شوق ہو محرم میں لکھنؤ کی سیر کرے اور دیکھے کہ یہ دینی سوگواری دیگر اقوام و ملل کی سوگواریوں سے کس قدر بڑھی چڑھی ہے۔

یہاں محرم کے شروع ہوتے ہی عزاداران حسین کا لباس سیاہ، نیلا یا سبز ہو جاتا ہے۔ عورتیں چوڑیاں اور تمام زیور بڑھا دیتی ہیں۔ اور اُس کے عوض ہاتھوں میں سیاہ یا سبز ریشمی پہونچیاں اور کانوں میں سیاہ و سبز ریشمی پھول پہن لیے جاتے ہیں۔ بال کھول دیے جاتے ہیں۔ اور خاص عاشورے کے روز بھوسا اور خاک اڑا کے سر پر ڈالا جاتا ہے۔ پان کھانا مرد و عورت سب چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پانوں کے عوض گوٹا کھایا جاتا ہے۔ تعزیوں کے جلوس عزاداری کا ایک مکمل ترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اور مجالس عزا ثبوت دیتی ہیں کہ غم منانے میں ہم دنیا کی قوموں سے کس قدر بڑھ گئے ہیں۔

نامور مصنفین کی مقبول تصنیفات

یعنی مولوی محمد حسین صاحب آزاد، علامہ شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی، سر سید احمد صاحب، مولینا حالی پانی پتی، نواب محسن الملک، میاں بشیر احمد خلف الرشید مولوی نذیر احمد صاحب، مصور غم علامہ راشد الخیری، مصور فطرت خواجہ حسن نظامی، حکیم محمد علی صاحب تلمیذ رشید و جانشین سعید علامہ شبلی مرحوم یعنی مولوی سید سلیمان صاحب ندوی، ادیب زمانہ و مورخ یگانہ مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر مدظلہ العالی وغیرہ قابل مصنفین زمانہ حال و ماضی کی تصنیفات و تالیفات ہماری دکان سے طلب کی جا سکتی ہیں نقد قیمت روانہ فرمانے پر یا بذریعہ وی پی تعمیل ارشاد ہو گی۔ اگر کوئی کتاب خدانخواستہ دکان موجود نہ ہوئی تو حتی الوسع تلاش کر کے بہم پہنچا دی جاویگی ختم ہو گئی ہو گی تو مجبوری ہے، نیز دنیائے ادب و اخلاق کی مشین یعنی مرزا سلطان احمد صاحب ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر کی جملہ تصانیف بھی ہم سے طلب فرمائیں، خان احمد حسین خان صاحب چیف اڈیٹر مشہور و مقبول رسالہ شباب اردو کی نظمیں اور اخلاقی ناول و سراغ رسانی کے ناول بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

جلد دلگداز بابت ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء جو اردو ادب اور انشا پردازی کی جان ہیں جن سے جن صاحبوں نے فائدہ اٹھایا وہ آجکل کے مشہور مصنف اور نامور ادیب بن گئے جن کی سطروں کا معاوضہ بلا مبالغہ پونڈ ہوتے ہیں، اگر جلدی ان جلدوں کو طلب نہ کر لیا گیا تو پہلے کی طرح پھر یہ کسی قیمت پر بھی نہ مل سکیں گی کیونکہ بہت تھوڑی تعداد میں طبع ہوئی ہیں نیز شاعرانہ و عاشقانہ مضامین جو مولانا کے دلگداز میں آج تک نکلتے رہے ہیں مولینا موصوف کی ترمیم و اضافہ سے طبع ہو رہے ہیں جو عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ تیار ہو جائیں گے شائقین ادب و دلدادگان لٹریچر پہلے ہی سے درخواستیں روانہ فرمائیں تو نایابی کے اندیشہ سے محفوظ رہیں گے۔ فہرست کتب بغیر ایک آنہ کے ٹکٹ آئے روانہ نہ ہو گی

المشتہران

عبد الرشید اینڈ برادر تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

کتبہ منشی خوش رقم لاہوری

TITLE PRINTED AT THE NATIONAL ART PRESS, LAHORE.